بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد نمبر ۷۹ ماہ دسمبر ۲۰۱۱ء مطابق محرم الحرام ۱۴۳۳ء شمارہ نمبر ۱۲

مدیر
خلیل الرحمان سجاد نعمانی
E-mail : ilm.zikr@yahoo.com

اس شمارہ میں

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ
آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ
بصیغہ V.P. ارسال کیا جائے گا جس میں آپ کے -/35 روپے زائد خرچ ہوں گے — منیجر

ضروری اعلان

درج ذیل مقامات میں الفرقان کی توسیع اشاعت کی ذمہ داری جن حضرات نے قبول کی ہے ان کے نام اور فون نمبر نیچے لکھے جارہے ہیں۔ان مقامات اور قرب وجوار کے حضرات اُن سے رابطہ قائم کریں۔

مقام	نام	فون نمبر
۱-اورنگ آباد	مولانا انیس الرحمٰن ندوی	(0)9423456752
۲-مالیگاؤں	مولانا حسنین محفوظ	(0)9226876589
۳-بیلگام	مولانا تنویر صاحب	(0)9880482120
۴-بارہ مولا (جموں کشمیر)	سجاد الجید	(0)9906428932
۵-بڑودہ (گجرات)	مفتی محمد سلمان صاحب	(0)9898610513

مرتب: یحییٰ نعمانی

ناظم شعبۂ رابطہ عامہ : بلال سجاد نعمانی
E-mail: nomani_sajjadbilal@yahoo.com

☆سالانہ چندہ برائے ہندوستان　عمومی 180روپے
☆ سالانہ چندہ برائے ہندوستان　خصوصی خریداران 400روپے
☆سالانہ چندہ برائے ہندوستان (وی پی سادہ)　210روپے
☆سالانہ چندہ برائے پاکستان، پاکستان میں-/1200 ہندوستان میں-/750 روپے
☆بیرونی ممالک بذریعہ ہوائی جہاز　-/20پاؤنڈ -/40ڈالر　خصوصی خریداران -/30£

لائف ممبر شپ فیس: ہندوستان-/5000 روپے، بیرونی ممالک 500پاؤنڈ　1000ڈالر

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ: Mr. RAZIUR RAHMAN 90-B HANLEY ROAD, LONDON N4 3DW (U.K) ,Fax & Phone : 020 72721332

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: ادارہ اصلاح وتبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ لاہور۔(فون:7663696 - 7655012)

ادارہ کا مضمون نگار کی فکر سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ الفرقان 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ- 226018

فون نمبر:0522-4079758　e-mail : alfurqan_lko@yahoo.com

خلیل الرحمن سجاد کے لئے پرنٹر پبلشر محمد حسان نعمانی نے کاکوری آفسٹ پریس کچہری روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہ اولیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

داروکوئی سوچ اِن کی پریشاں نظری کا

——————— مدیر

اس حقیقت کا انکار کوئی عقل کا اندھا، یا عصبیت کا مارا ہی کر سکتا ہے کہ چودھویں صدی ہجری میں پورے کرۂ ارض میں پھیلی ہوئی ملتِ اسلامیہ کی بہت بڑی تعداد کو ارتداد، غفلت اور دین سے دوری جیسی لعنتوں سے نجات دلوانے، اور بھٹکے ہوئے آہووں کو سوئے حرم لانے کا عظیم کام تقدیرِ خداوندی نے جن اجتماعی محنتوں سے لیا ہے، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی برپا کردہ تبلیغی محنت کا نام ان میں سرفہرست ہے۔ اور توفیقِ الٰہی سے الفرقان کو اپنے بانی کی بدولت یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اس عظیم جدوجہد کے ابتدائی عہد سے ہی اس عظیم محنت اور اس کے قابل صد احترام قائدین کا قدردان اور ترجمان رہا ہے۔ اسکی گذشتہ ستر سال سے بھی زیادہ فائلیں، آج بھی اس کی شاہدِ عدل ہیں۔

ان سطور کا یہ ناچیز راقم بھی تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہے کہ اس کی زندگی کے تقریباً بیس سال اس جدوجہد سے اس طرح کی عملی وابستگی میں گذرے ہیں کہ اس کے بزرگوں کو اس سے اِس سلسلہ میں افراط اور غلو کی شکایت تو ہوتی تھی، تفریط اور کوتاہی کی نہیں۔۔۔ ذکر چھڑ گیا ہے تو اپنی زندگی کا ایک واقعہ آج لکھ دینے کا دل چاہ رہا ہے۔ غالباً ۸۵۔۱۹۸۶ء کی بات ہے، ایک دن اچانک اس ناچیز کو مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ "مولانا سے اجازت لے کر تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس تکیہ (رائے بریلی) آجاؤ۔ میں جلد از جلد تعمیلِ حکم میں وہاں حاضر ہو گیا، تو بالکل تخلیہ میں حضرت مولانا نے (اللہ ان کو اعلیٰ ترین درجاتِ قرب سے نوازے) اپنے مخصوص مشفقانہ لہجہ میں اور ایک لمبی تمہیدی گفتگو کے بعد یہ نصیحت کی کہ:

"تمہیں اللہ نے اچھی علمی استعداد عطا کی ہے، ہم اور مولانا (یعنی میرے والد بزرگوار اور ان کے رفیقِ محترم) یہ دیکھ کر فکرمند رہتے ہیں کہ تم علمی کاموں کی طرف

کم توجہ کر رہے ہو، تبلیغ میں ضرور لگے رہو، مگر بہر حال کچھ تناسب ضرور مقرر کرو!،
پچاس اور پچاس کا ہو یا کچھ کم و بیش۔۔۔۔‘‘

میں اپنی تمام کوتاہیوں، تقصیرات اور بے اعتدالیوں پر صدق دل سے اللہ سے معافی مانگتے ہوئے یہ عرض کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ بلا شبہ اس عظیم کام سے عملی وابستگی سے اور اس کے عالی مقام ترجمانوں، والدِ ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب مہاجر مدنی، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری اور الحاج عبدالوھاب صاحب (رائے ونڈ) کی شفقتوں، عنایتوں، توجہات اور تعلیم و تربیت سے اس عاجز کو جو نفع پہنچا ہے، اس کے بیان کرنے کے لئے اس کوتاہ قلم کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ انشاء اللہ کسی اور فرصت میں مقدر ہوا تو اس کام سے عملی وابستگی اور ان بزرگوں کی جوتیوں کی بدولت حاصل ہونے والے منافع کو بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

سر دست تو یہ موضوع چھیڑنے کا محرک جو واقعہ بنا ہے وہ سناتا ہوں۔ ہوا یہ کہ ۱۲/نومبر ۲۰۱۱ء کی صبح راقم سطور کے بڑے بھائی جناب مولانا محمد حسان نعمانی صاحب نے اس عاجز کو بتایا کہ ابھی چند دن پہلے لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں ایک اعلیٰ سطحی ذمہ دار نے دورانِ تقریر بہت زور دے کر کہا کہ:

’’جو شخص پیدل حج کرنے جا سکتا ہے، اس پر بھی حج فرض ہے، اسے چاہئے کہ وہ چار مہینہ کی پیدل جماعت میں نکل جائے، اور اسی دوران حج بھی ادا کر لے‘‘۔

یہ ایک بہت چھوٹا سا نمونہ ہے اُن ہزاروں جاہلانہ باتوں کا جو ہمارے یہ تبلیغی احباب روزانہ اپنے بیانات میں امت میں پھیلا رہے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ پانی سر سے نہیں چھت سے بھی اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ ہم جس تبلیغی دعوت کے قدردان ہیں وہ وہ ہے جس کا عظیم بانی کہا کرتا تھا:

’’ہماری تبلیغ میں علم و ذکر کی بڑی اہمیت ہے۔ بدون علم کے نہ عمل ہو سکے نہ عمل کی معرفت، اور بدون ذکر کے علم ظلمت ہی ظلمت ہے۔ اس میں نور نہیں ہو سکتا، مگر ہمارے کام کرنے والوں میں اس کی کمی ہے‘‘۔

(ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ: ص ۴۶)

اور جس نے شدید بیماری اور ضعف و نقاہت کے عالم میں ایک خاص خادم کو حکم دیا تھا کہ جمع ہونے والے مجمع سے یہ کہہ دو کہ:

''آپ لوگوں کی یہ ساری چلت پھرت اور ساری جد و جہد بیکار ہوگی، اگر اس کے ساتھ علمِ دین اور ذکر اللہ کا پورا اہتمام آپ نے نہیں کیا، بلکہ سخت خطرہ اور قوی اندیشہ ہے کہ اگر ان دو چیزوں کی طرف سے تغافل برتا گیا، تو یہ جد و جہد مبادا فتنہ اور ضلالت کا ایک نیا دروازہ (نہ) بن جائے۔'' (ایضاً ص ۳۹)

اور جس پر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اسی فکر کا زیادہ غلبہ تھا کہ کہیں آگے چل کر یہ تحریک علم و ذکر اور اہل علم و ذکر سے بے نیاز نہ ہو جائے، سنئے اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی گواہی:

''ان دنوں میں (یعنی حضرت مولانا الیاسؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں) چند باتوں کا زندگی بھر سے زیادہ اہتمام رہا۔ اول اور سب سے زیادہ علم و ذکر کی ترغیب و تاکید، اس تصور سے کہ یہ کام عام عصری تحریکات کی طرح محض ایک بے روح ڈھانچہ، قواعد و ضوابط کا مجموعہ اور ایک مادی نظام بنکر نہ رہ جائے۔ آپ برابر لرزاں ترساں رہتے تھے اور طبیعت پر اس کا ایک بوجھ تھا۔ بار بار اس سے ڈراتے تھے، بار بار علم و ذکر کے اہتمام کی تاکید فرماتے تھے۔ بار بار کہتے اور کہلواتے تھے کہ علم و ذکر اس گاڑی کے دو پہیے ہیں، جن کے بغیر یہ گاڑی چل نہیں سکتی، دو بازو ہیں جن کے بغیر اس کی پرواز نہیں۔ علم، بغیر ذکر کے ظلمت ہے۔ ذکر، بغیر علم کے فتنہ ہے۔ اور یہ تحریک و نظام ان دونوں کے بغیر سراسر مادیت ہے۔''

(حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت: ص: ۱۸۴، ۱۸۵)

ان آخری جملوں کو بار بار پڑھیے، اور سر دُھنیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد خود آگاہ آج کے حالات کو خداداد فراستِ ایمانی سے دیکھ رہا تھا، خود ڈر رہا تھا، اوروں کو ڈرا رہا تھا، کاش کہ آج کے لوگ اس جانب توجہ دیتے۔ کاش اور ہزاروں بار کاش!!!

بہر حال علمائے امت سے درخواست ہے کہ اس سنگین صورتِ حال کی فکر کریں، کہ یہ ان کی منصبی ذمہ داری ہے۔

دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

☆☆☆

محفل (۱۱۰) سورۃ النساء (۱۵)

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مدظلہٗ

مؤمن کے ہاتھ سے مؤمن کا قتل نا قابلِ تصوّر گناہ ہے غلطی سے ہو جائے تب بھی بھاری کفّارے کے بغیر معافی نہیں!

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

ترجمہ

کسی مومن کا یہ کام نہیں کہ ایک مؤمن کو قتل کرے، اِلّا یہ کہ غلطی سے ہوجائے۔ اور جو کوئی غلطی سے کسی مؤمن کو قتل کر دے تو اس کے ذمّہ ہے ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا اور خون بہا بھی جو اُس کے وارثوں کو ادا کیا جائے، اِلَّا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ اور اگر مقتول تمھاری کسی دشمن قوم سے تھا مگر تھا مؤمن تو اس کے عوض ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم میں سے تھا جس کے اور تمھارے درمیان معاہدہ ہے تو خون بہا اس کے وارثوں کو اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا۔ ہاں اگر کوئی اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو مسلسل دو ماہ کے روزے۔ یہ بطور توبہ ہے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی۔ اور اللہ علیم ہے حکیم ہے (۹۲) اور جو کوئی قتل کسی مسلمان کو کرے بالقصد تو اس کی سزا جہنم ہے، جس میں اسے ہمیشہ رہنا ہے۔ اور اللہ کا غضب اس پر ہے اور لعنت۔ اور اس کے لئے عذاب اس نے تیار کیا ہوا ہے بڑا سخت (۹۳) اے ایمان والو جب تم اللہ کے راستے میں (جہاد کے لئے) نکلو تو چاہئے کہ تحقیق سے کام لو اور جو کوئی سلام تمھیں کرے تو (یوں ہی) مت کہہ دیا کرو کہ تو مسلمان نہیں (بلکہ بن رہا ہے)۔ کیا تم دنیوی زندگی کے سروسامان کے طلبگار ہو؟ حالانکہ اللہ کے پاس تو بہت مالِ غنیمت (تمھارے لئے) ہے۔ اور (دیکھو) تم خود پہلے ایسے ہی تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، لہٰذا تحقیق کرلیا کرو۔ اللہ کو خوب خبر تمھارے اعمال کی ہے (۹۴)

مشرک قبائل پر جہاد میں ایک خاص احتیاط کا حکم

دارالاسلام (مدینہ) سے باہر والے منافقوں کے احکام ختم ہوئے، لیکن منافقوں کے ساتھ وہاں سچے مسلمان بھی ہو سکتے تھے کہ کسی مجبوری سے رہ رہے ہوں۔ تو ان میں سے اگر کوئی شخص جہاد کے موقع پر کسی مسلمان کی تلوار کی زد میں آجائے، اور حالات جیسے بے یقینی اور بے اعتباری کے چل رہے تھے اس میں یہ بعید نہیں تھا، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ قرآن کے ایسے تمام ہی احکام ضرورت سامنے آنے پر نازل ہوئے ہیں

۔چنانچہ بعض واقعات ایسے ہو بھی گئے، انھیں کی طرف اشارہ اس دوسری آیت میں ہے جس میں فرمایا گیا کہ ’’’جب تم جہاد میں نکلے ہوئے ہو تو تحقیق سے کام لیا کرو اور (یوں ہی) مت کہہ دیا کرو کہ۔۔۔۔‘‘ مفسرین نے کئی ایک واقعات ترمذی، مسند احمد وغیرہ کے حوالے سے درج کئے ہیں۔لیکن سب سے زیادہ مستند واقعہ اس آیت کے حوالے سے ابنِ کثیر کے مطابق یہ آیا ہے کہ صحابہ کے ایک دستے کا گزر قبیلۂ بنو سلیم کے ایک شخص پر ہوا جو بکریوں کا ریوڑ لئے ہوئے تھا۔اس نے ان کو دیکھ کر السلام علیکم کہا (جس کا مطلب تھا کہ وہ مسلمان ہے) مگر انھوں نے سمجھا کہ جان بچانے کو کر رہا ہے اور اسے مار کے اس کی بکریوں کو مالِ غنیمت ٹھیرالیا۔اسی روایت کو روح المعانی میں بھی پہلے نمبر پر ذکر کیا گیا ہے۔اور آیت کے فقرہ تَبۡتَغُونَ عَرَضَ الۡحیوٰةِ الدُّنیا میں پائی جانے والی تعریض سے واقعہ کی جو نوعیت ظاہر ہوتی ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہو رہی ہے۔

روایت کے الفاظ پر یہ اضافہ کیا جانا غلط نہ ہوگا کہ علاقہ چونکہ غیر مسلموں کا تھا اس لیے صحابۂ کرام کے ذہن پر یہ شک حاوی ہوسکتا تھا کہ بکریوں کا ریوڑ ساتھ ہے، انھیں لیکر بھاگ سکتا نہیں، اس لئے مسلمان بن رہا ہے۔مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں ایک شخص کی طرف سے سلام کے بعد یہ تحقیق کئے بغیر کہ اس سلام میں سچائی کا کوئی شائبہ ہے یا بالکل بناوٹ ہے، اس کے ساتھ دشمن کافروں والا سلوک کرنا نہایت سنگین بات تھی۔الغرض یہ پس منظر ہے جس نے ان احکام کی ضرورت پیدا کی اور فرمایا گیا کہ مؤمن کی شان نہیں کہ اس کا ہاتھ ایک مؤمن کی جان پہ اُٹھے، بجز اس صورت کے کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔غلطی سے ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ نشانہ کسی کا تھا زد میں کوئی دوسرا آ گیا۔دوسری صورت جو مذکورہ بالا واقعہ پر منطبق ہوتی ہے یہ ہے کہ کسی کو حربی مشرک سمجھ کر اس کا خون حلال سمجھ لیا گیا۔

غلطی سے مقتول مؤمنین کی مختلف قسمیں اور احکام

یہ واقعات جن حالات میں پیش آئے ان میں جہاں بہت سے مشرک قبائل واقوام سے دشمنی کا علاقہ چل رہا تھا وہاں بعض ان میں ایسے بھی تھے، جیسا کہ اوپر ذکر میں آچکا، کہ ان سے معاہدۂ امن بندھا ہوا تھا۔ان دونوں کے لئے الگ الگ حکم دیا گیا ہے۔علاوہ ازیں ایسے کسی واقعہ کی یہ صورت بھی ہوسکتی تھی کہ بالکل اپنے ہی آدمی پر، جس کے ایمان کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا، غلطی سے ہاتھ چل گیا، اس کا جدا حکم ہے۔ان تینوں صورتوں کا الگ الگ حکم پہلی آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ارشاد ہوا ہے : وَمَنۡ

قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً۔۔۔(جس نے کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دیا ہو اس کے ذمہ کفّارے کے طور پر ایک غلام آزاد کرنا ہے اور مزید برآن خوں بہا، جو اس کے وارثوں کے حوالے کیا جائے۔ اِلّا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔) یہ حکم اس مسلمان بھائی کے قتلِ خطا کا ہے جس کا مسلمان ہونا معلوم و مسلّم تھا۔ گویا ایک ہی معاشرے کے دونوں تھے۔ اور بظاہر اسی لئے وارثوں کی طرف سے معافی کے لئے بطورِ ترغیب صدقے کا لفظ (اَنْ يَّصَّدَّقُوا) لایا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہوا معافی سے وہ ثواب کمانے کی ترغیب جو ثواب کسی بھاری صدقے سے مل سکتا تھا اور دو خاندانوں کے اسلامی رشتے میں اس دراڑ کو بند کرنے کی تدبیر جو اس خونیں واقعہ سے پڑ سکتی تھی۔

مزید دو صورتیں آگے یہ بیان فرمائی گئیں (۱) مقتول مسلمان تھا، مگر کسی دشمن کافر قوم سے تعلق رکھتا تھا، یعنی باوجود مسلمان ہونے کے کسی عذر کے ماتحت اپنی کافر قوم ہی میں رہ رہا تھا۔ (فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ) (۲) یہ کہ مسلمان تھا اور ایک کافر قوم ہی سے تعلق رکھتا تھا مگر یہ قوم مسلمانوں کے ساتھ معاہدے میں تھی، دشمنوں کی تعریف میں نہیں آتی تھی۔ (وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيْثَاقٌ۔) ان میں سے پہلی صورت کے لئے فرمایا گیا کہ اس کے قتل کی غلطی کے کفارے میں ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا۔ یہاں خوں بہا (دیت) نہیں ہے۔ دوسری صورت میں جس کا تعلق مُعاہد قوم سے ہے، حکم ہوا کہ اس کا خون بہا اس کے ورثہ کو دیا جائے گا اور ایک مؤمن غلام بطور کفارہ آزاد کرنا ہوگا۔ تو یہاں نہ صرف خون بہا ہے بلکہ اسے غلام کی آزادی پر مقدم کیا گیا ہے۔ اور یہ فرق معاہد قوم ہونے کی وجہ سے ہے۔ معاہدے کی بنا پر اس کا وہی حق ہے جو مسلمان قوم کا ہوتا ہے۔ اور دیت کو بیان میں مقدم کر کے گویا اس کی عجلت کا اشارہ دیا گیا ہے۔ یہ بظاہر اس مقصد سے کہ کافر قوم میں مسلمانوں کو بدعہد سمجھے جانے کی نوبت نہ آنے پائے۔ غلام آزاد کرنے کے حکم کے ساتھ مزید فرمایا گیا کہ اگر کسی کے پاس غلام آزاد کرنے کو نہ ہو، نہ ہی مالی استطاعت غلام خرید لینے کی تو مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے۔ کہ ''یہ اللہ نے اس گناہ سے توبہ کا (یا توبہ قبول کرنے کا) طریقہ ایسوں کے لئے رکھا ہے۔''

ان احکام پر سنجیدگی سے غور میں قرآن پر ایمان کا سامان ہے

یہ احکام شرح ہیں اِن آیتوں میں کے شروع کے اس جملے کی کہ ''مؤمن کی شان نہیں کہ وہ ایک مؤمن کو قتل کرے اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔'' یعنی غلطی سے ایسا ہو جائے تو ایمانی شان کی برقراری کے

لئے یہ سب کرنا لازم ہوگا، یہ اس مالک کا حکم ہے جو علیم وحکیم ہے۔ بظاہر ان احکام کی تاکید ہی کے لئے آگے فرمایا گیا کہ جو کوئی جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کردے گا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ اللہ کے غضب اور اس کی لعنت کے ساتھ سدا کو رکھا جائے گا۔ اور بڑے سخت عذاب سے اس کو واسطہ پڑے گا۔ (اور دنیوی سزا میں جو قصاص کا قانون اس کے علاوہ ہے وہ الگ۔) آدمی قرآن کے انہی احکام پر غور کرے تو قرآن پر ایمان کی توفیق کے لئے کافی ہے۔ کس قدر سنجیدہ معاملہ ان آیتوں کی روشنی میں ایمان نظر آتا ہے۔ غلطی سے بھی ایک مؤمن کے قتل میں دیت اور خون بہا کافی نہیں ہے، اس پر ایک بھاری کفّارہ بھی لازم آئے گا، جو ایک غلام باندی کی آزادی اس زمانے میں تھی۔ (اور ہمارے زمانے میں وہ چونکہ ممکن نہیں اس لئے اس کا بدل فقہاء نے مالی پیمانے سے مقرر فرمادیا ہے۔) پھر کفارے میں غلام آزاد کرنے کی معنویت بھی توجہ طلب ہے۔ یہ دوسرے درجے کا قصاص ہوا، کہ ایک جان لی تو ایک جان ہی کو اپنے قبضے سے آزادی دینا اس کا کفارہ ہوگا۔ البتہ کفارے کی اس شکل کی ادائیگی کی استطاعت آدمی میں نہیں ہے تو دوماہ کے مسلسل روزے رکھے تب ہی وہ اپنے ایمان کو دوبارہ معتبر کراسکتا ہے۔ یہاں جس ایک صورت میں صرف کفارہ ہے، دیت نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ دیت آدمی کا ترکہ ہوتی ہے۔ اور مؤمن کا ترکہ دارالحرب میں رہنے والوں کو نہیں مل سکتا۔ وہ کافر قوم جس سے معاہدے کا نہیں بلکہ دشمنی کا علاقہ ہے اس کا ملک اور مسکن دارالحرب ہے۔

ان احکام کے پس منظر کا اشارہ

آخری آیت (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ۔۔۔) میں مذکورہ بالا احکام کا پس منظر بیان ہورہا ہے، جس کا خلاصہ اوپر دیا گیا تھا کہ بعض مؤمنین کے قتلِ خطا کا واقعہ پیش آیا تھا جس پر یہ پہلی آیت والے احکام نازل ہوئے۔ فرمایا کہ اے ایمان والو تم جب اللہ کی راہ (جہاد) میں نکلو تو راستے میں (دشمنوں کے علاقے میں) کوئی شخص تم کو ملے اور سلام کرے تو محض گمان سے اس کے سلام کو بناوٹ پر محمول کرکے اسے حلال الدّم کافر مت جان لو۔ بلکہ تحقیق سے کام لو۔ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔۔۔ (تمھیں دنیا کے مال ومتاع کی طلب ہے تو اللہ کے پاس مالِ غنیمت کے ڈھیر ہیں، پس کسی بے صبری کی ضرورت نہیں۔) اور وہ ڈھیر اس حد تک مل کر رہے کہ اُٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ چار دانگِ عالم میں پھیلے ہوئے دارالاسلام میں زکوٰۃ کا مستحق ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ پھر فرمایا کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ

اللہُ عَلَیْکُمْ (تم تو خود ایک زمانے میں ایسے ہی تھے، اسے بھول گئے) یعنی شروع شروع میں تمھارے پاس بھی اپنے سچ مچ مؤمن ہونے کی کوئی دلیل نہیں تھی، بس ایک کلمہ جو تمھیں مؤمن ظاہر کرے، وہ کافی سمجھا گیا تھا۔ فَتَبَیَّنُوا اِنَّ اللہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (پس لازم ہے کہ کوئی اجنبی ذرا بھی اظہارِ اسلام کرے تو اسے قابلِ لحاظ سمجھو اور کوئی وجہ شبہ کی ہو تو تحقیق سے کام لیکر فیصلہ کرو، اور یاد رکھو کہ تمھاری ہر بات پر اللہ کی نظر ہے)

مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی

کچھ صاحب "خطبات ہند" کے بارے میں

[درجِ ذیل مضمون حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کے سفرِ ہند (اپریل ۲۰۱۱) کے خطبات کے مجموعہ "خطباتِ ہند" کے ابتدائیہ کے طور پر بعجلت تحریر کیا گیا تھا، الفرقان کے محترم قارئین کی خدمت میں بھی پیش کیا جارہا ہے

——مدیر]

بڑی مدت سے ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ مے خانہ

پندرہویں صدی ہجری کے ابتدائی دوعشروں تک برصغیر میں اکابر اہل علم وفکر اور مصلحین کی ایک تعداد موجود تھی، ۱۴۰۲ھ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد بھی، عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سعید احمد خاں صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا فقیر محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد اشرف خاں

صاحب رحمۃ اللہ علیہ پشاور، حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ، اوران کے علاوہ اور بھی ربانی علماء موجود تھے، جن سے لاکھوں لوگوں کو فیض مل رہا تھا، پھراچانک تیز رفتاری کے ساتھ یکے بعد دیگرے یہ سب اپنے اپنے وقت پر راہیِ ملک بقا ہوگئے، اور یہ حال ہوگیا کہ ایسے پرنور چہرے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں، اوراہل طلب رنج وغم کی کیفیت میں ڈوب کر کہنے لگے کہ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

لیکن اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس امت کو کبھی بھی بے سہارا نہیں چھوڑے گا، یہ تو وہی جانے کہ کس ٹوٹے دل والے کی آہ اُسے پسند آئی؟ اور کس کے ذوقِ جستجو پر اس کو رحم آیا؟ ہم کوتاہ بینوں نے تو بس یہی دیکھا کہ اچانک مغربی پنجاب کے ایک مقام ''جھنگ'' سے ایک شخصیت برصغیر کے افق پر ہلال رشد وہدایت بن کر ابھری، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روشنی سے پورا مطلع روشن ہونے لگا، دلوں کی زمین اِس ابرِ رحمت سے سیراب ہونے لگی اور یاس آس میں بدلنے لگی۔ آپ خود ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ صاحب خطبات ریحانۃ العصر حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کی طرف ہے۔

اس ضرورت کے احساس کے تحت کہ وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ جن کے دل میں صاحب خطبات کی طرف غیر معمولی محبت وانجذاب دن بہ دن بڑھتا ہی جارہا ہے، مگر وہ اپنے اس ''انجانے'' محبوب کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا اشتیاق رکھتے ہیں، یہ عاجز راقم سطور معتبر ومستند ذرائع سے جو کچھ جانتا ہے —— اور اسے اعتراف ہے کہ وہ بہت کم جانتا ہے —— سطور ذیل میں اپنے محترم اور باذوق قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔

ولادت اور ایام طفولیت:

صاحب خطبات (متَّعنااللہ بطولِ بقائِه) کی ولادت یکم اپریل ۱۹۵۳ء کو جھنگ (پنجاب، پاکستان) میں ہوئی۔ ان کے والد بچوں کو، لوجہ اللہ، ناظرۂ قرآن پڑھایا کرتے تھے، نہایت نیک صالح اور عبادت گذار تھے، روزانہ تہجد کے بعد تین سے پانچ پارے قرآن مجید کی تلاوت کا معمول تھا، والدۂ ماجدہ بھی نیک صالح خاتون تھیں —— خود صاحب خطبات نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''راقم جب تین برس کی عمر کا تھا اور والدہ صاحبہ کے ہمراہ ایک بستر پر سوتا تھا تو رات کے آخری

پہر میں والدہ صاحبہ کو بستر پر موجود نہ پا کر اٹھ بیٹھتا، دیکھتا تھا کہ وہ سرہانے کی طرف مصلیٰ بچھا کر نماز تہجد پڑھنے میں مشغول ہیں، راقم منتظر رہتا کہ نماز کب ختم ہوگی؟ والدہ صاحبہ نماز کے بعد دامن پھیلا کر اونچی آواز سے رورو کر دعائیں مانگتیں، راقم نے اپنی زندگی میں تہجد کے وقت جس قدر اپنی والدہ صاحبہ کو روتے دیکھا ہے کسی اور کو اس قدر روتے نہیں دیکھا۔ بعض اوقات والدہ صاحبہ راقم کا نام لے کر دعائیں کرتیں تو راقم خوشی سے پھر بستر پر سو جاتا''۔

حضرت کی ابتدائی تعلیم وتربیت اور نگرانی میں ان کے بڑے بھائی جناب ملک احمد علی صاحب کا بھی نمایاں حصہ رہا—— حضرت کو خود اعتراف ہے کہ ان ہی کی مشفقانہ مگر سخت نگرانی کی بدولت وہ غلط لڑکوں کی دوستی اور صحبت سے بالکل محفوظ رہے۔

تبلیغی جماعت سے تعلق:

حضرت جب پانچویں کلاس کے طالب علم تھے، تب ہی سے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ تبلیغی جماعت میں نکلنے کا معمول شروع ہوگیا، یہ تعلق آگے چل کر اور زیادہ مستحکم ہوگیا—— دوسری طرف اسکول اور کالج کی تعلیم کے ساتھ فارسی اور عربی کی کتابیں اور صرف ونحو کی تعلیم بھی جاری رہی، B.S.C کے بعد حدیث کی کچھ کتابیں بھی پڑھیں۔ اسی دوران تذکرۃ الاولیاء، غنیۃ الطالبین اور کشف المحجوب جیسی کتابوں کا مطالعہ کیا، اور ان ہی کتابوں کے مطالعہ کے اثر سے معرفت الٰہی کے حصول کا وہ جذبہ جو فطرت میں پہلے ہی سے ودیعت کر دیا گیا تھا، جاگ اٹھا، اور پھر مختلف خانقاہوں میں جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا، لیکن خود حضرت کے الفاظ میں:

''ہر جگہ اتباع سنت میں کوتاہی اور بدعات کی پابندی دیکھ کر راقم نامراد واپس آجاتا''

(حیات حبیب ص ۷۴۵)

محبت الٰہی کی چنگاری:

اسی دوران شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''فضائل ذکر'' میں جب یہ واقعہ اس صالح نوجوان کی نظر سے گذرا کہ:

''حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے جرجانی کو دیکھا کہ ستو پھانک رہے ہیں، میں نے پوچھا، یہ خشک ہی پھانک رہے ہو، کہنے لگے، میں نے روٹی چبانے اور ستو پھانکنے

کا جب حساب لگایا تو چبانے میں اتنا وقت زیادہ خرچ ہوتا ہے کہ اس میں آدمی ستر مرتبہ سبحان اللہ کہہ سکتا ہے ،اس لئے میں نے چالیس برس سے روٹی کھانا چھوڑ دی،ستو پھانک کر گذارا کر لیتا ہوں''۔

تو اس واقعہ کا اثر اس کی حسّاس اور جو یائے حق طبیعت پر ایسا پڑا کہ صبح وشام لیٹے چلتے پھرتے ہر وقت سبحان اللہ،سبحان اللہ کا ذکر اس کی زبان پر جاری ہو گیا،اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ قلت کلام،قلت طعام اور قلت منام کی عادت پڑ گئی۔ (ایضاً ص ۶ ۷۴)

ڈھائی سال تک یہ نوجوان بس سبحان اللہ! سبحان اللہ کا ورد کرتا رہا۔مگر اب طبیعت کسی رہبر و مربی کے پانے کے لئے بے قرار ہوتی جارہی تھی ، یہ احساس ہر دم بے چین کئے رہتا کہ:

''کوئی ایک متبع سنت ،صیقل شخصیت سامنے نہ تھی ، جسے پیر و مرشد کی حیثیت سے دل میں سمایا جاتا،آنکھوں میں بسایا جاتا اور من کی دنیا میں سجایا جاتا''

پورے دو سال تک روزانہ صلوٰۃ الحاجت پڑھ کر یہ تڑپتی ہوئی تمنا دعا بن کر ان کی زبان پر آتی رہی کہ:

''بار الٰہا! کسی سچے اور کامل مرشد کی صحبت وارادت نصیب فرما!''

رحمت خداوندی کی ایک نظر

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اللہ کا ایک بندہ ،اور وہ بھی بالکل نوجوان ،سالہا سال سے اللہ کی محبت کے لئے تڑپتا رہے اور بارگاہ احدیت وصمدیت سے کوئی التفات نہ ہو،وہ التفات ہوا، اور خوب ہوا،آیئے اس کی داستان خود ان ہی کی زبانی سنئے ! حضرت لکھتے ہیں :

''1971 میں تبلیغی جماعت محلے کی مسجد میں ٹھہری ہوئی تھی ،راقم نے سوچا کہ اعتکاف کی نیت سے مسجد میں ہی سو یا جائے ،حسب عادت رات تہجد کی نماز کے لئے اٹھنے کی توفیق ہوئی ، نماز کے بعد تسبیحات وغیرہ سے فارغ ہوا تو ،ابھی صبح صادق میں ایک گھنٹہ باقی تھا،راقم مصلے پر ہی لیٹ گیا،خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ آئے اور راقم کے قلب پر انگلی رکھ کر کہنے لگے......اللہ ......اللہ......اچانک آنکھ کھلی تو راقم کے بدن پر رعشہ طاری تھا،سینے میں قلب کی تیز اور نرم حرکت ایسی واضح محسوس ہو رہی تھی کہ گویا سینے میں گدگدی ہو رہی ہو۔راقم کے لئے اس کیفیت کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا،حتی کہ سینے پر رومال کس کے باندھ لیا، جب رومال کھولا جاتا وہی گدگدی محسوس ہوتی ،کئی دن کپڑوں کے نیچے رومال باندھ

کر گذارے۔ (اب) نماز.... ذکر... تلاوت کا مزہ ہی نرالا تھا، ہر چیز میں لذت.. ہر بات میں لذت......'' (حیات حبیب ص ۷۴۔۷۶)

یاد رہے کہ یہ زمانہ وہ تھا جب یہ خوش نصیب وخوش خصال نوجوان انجینئرنگ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا، اس عجیب وغریب تجربے کے بعد اس بندۂ خدا نے اسی یونیورسٹی میں زیر تعلیم اپنے ایک صالح دوست جناب محمد امین صاحب سے اپنے اِن حالات کا تذکرہ کیا، انھوں نے ایک اور مرد صالح سے اپنے دوست کے یہ حالات سنائے، انھوں نے معاملے کی اہمیت محسوس کر کے ایک اور خضر صفت بزرگ کو ان حالات کی اطلاع دے کر رہنمائی لینے کا مشورہ دیا——

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا بھی تعارف کرا دیا جائے، جن کا ہمارے ممدوح (حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی) کی شخصیت سازی میں مشیت خداوندی نے اپنا اپنا حصہ لگوایا۔

وہ پہلے بزرگ جن سے صاحب خطبات کے دوست نے ان کے مذکورہ بالا خواب اور اس کے بعد کے احوال کا تذکرہ کیا تھا وہ تھے حضرت شیخ وجیہ الدین صاحب، یہ تھے تو انجینئر، اور وہ بھی انڈیانا یونیورسٹی، امریکہ کے سند یافتہ، لیکن فطری طور پر ان کو تقوی اور احتیاط والی زندگی کا غیر معمولی اہتمام نصیب تھا، ان کا تعلق بھی تبلیغی جماعت سے تھا، اور اسی کی بدولت اُن کے دل میں اللہ کی محبت وقرب کے حصول کی طلب وجستجو پیدا ہوئی۔ انھوں نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی سے بیعت کا رابطہ بھی قائم کیا—— اور میر پور خاص کے ایک صاحب دل اور صاحب مقام بزرگ بابو جی عبداللہ سے بھی والہانہ محبت کے رشتے میں منسلک ہو گئے، یہ ایک عجیب وغریب اور پر اسرار شخصیت تھی، نیز اس بات کی واضح نشانی کہ اللہ جس کو چاہے نواز دے، دیکھنے میں تو وہ ایک ایمان دار سرکاری ملازم اور اسٹیشن ماسٹر تھے لیکن درحقیقت وہ ایک مخفی شخصیت تھی، اُن کے مقام کا اندازہ کرنے کے لئے صاحب خطبات کی یہ گواہی غور سے پڑھیں کہ:

''حضرت بابو جی رحمۃ اللہ علیہ کو بارگاہ رسالت میں ایسی قبولیت نصیب ہوئی تھی کہ آپ جس شخص کے بارے میں دعا فرما دیتے کہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہو، عموماً اسے تین دن کے اندر زیارت ہو جاتی۔ تبلیغی جماعت جھنگ کے امیر جناب صوفی محمد دین صاحب نے راقم الحروف سے رائے ونڈ کے اجتماع پر کہا: ''اپنی طرف سے تو اعمال صالحہ کی بہت کوشش کرتا ہوں، لیکن عجیب بات ہے کہ ابھی تک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب نہیں ہوئی، راقم

الحروف نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے ان کی ملاقات حضرت بابو جیؒ سے کرادی اور حضرت بابو جیؒ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے ازراہ کرم دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

جناب صوفی محمد دین صاحب کو تین دن کے اندر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تو انھوں نے شکریہ کا خط لکھا۔ (حیات حبیب ص ۸۳۔ ۶۸۲)

ہم لوگوں نے متعدد بار حضرت سے بابو جی کا ذکر خیر سنا ہے، حضرت نے حیات حبیب میں بھی ان کا خاصا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ وہیں سے ایک واقعہ اور نقل کرتا ہوں:

''ایک مرتبہ حضرت بابو جیؒ کو خواب میں تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا کہ ''یہ عبداللہ مجھ تک آنا چاہتا ہے مگر اس میں اتنی ہمت نہیں کہ آسکے.... آپ اسے مجھ تک پہنچا دیں، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ کے قلب پر انگلی رکھ کر فرمایا: ''کہو اللہ ...... اللہ ...... اللہ، ایک دم آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ کے رگ وریشے میں اللہ کا ذکر سرایت کر چکا تھا۔ صدیق اکبرؓ کی ایک توجہ ہی نے واصل کر دیا ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

تو یہ تھے وہ بزرگ جن سے محبت کا رشتہ جوڑ رکھا تھا شیخ وجیہ الدین صاحب نے جو ایک صاحبِ دل صاحبِ باطن بزرگ تھے، وہ ان ہی کے زیر نگرانی سلوک کے معمولات پورے کرتے رہے—— آگے چل کر شیخ وجیہ الدین، سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے عظیم بزرگ اور مسلّم فقیہ حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوگئے، ان کے بھی احوال جو حضرت نے ''حیات حبیب'' میں بیان کئے ہیں وہ بھی نہایت بلند اور پاکیزہ ہیں۔

اب ہم واپس آتے ہیں اپنے اصل موضوع کی طرف، تذکرہ چل رہا تھا کہ حضرت نے اپنی جوانی میں ایک خواب دیکھا جس کے بعد قلب کی عجیب وغریب کیفیت محسوس ہونے لگی۔ اس خواب کا تذکرہ آپ نے اپنے ایک دوست سے کیا، جنھوں نے اِن ہی بزرگ یعنی حضرت شیخ وجیہ الدین سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے یہ رائے دی کہ:

''بہتر ہے کہ بابو جی کو خط لکھ دیا جائے''

چنانچہ حضرت نے بابو جیؒ کو ایک خط لکھا، جس کے جواب میں انھوں نے حضرت کو لکھا:

''معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قلب جاری ہو چکا ہے، آپ فوراً کسی شیخ سے بیعت ہو جائیں، ورنہ شیطان مردود فتنے میں نہ ڈال دے۔''

یہ خط پڑھ کر حضرت نے اپنے ان ہی دوست کے مشورہ سے یہ طے کیا کہ ان ہی بزرگ سے جن سے حضرت شیخ وجیہ الدین صاحب کا تعلق ہے، ان ہی سے بیعت ہو جائیں، یعنی حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے، اور اسی ارادے سے لاہور آ کر شیخ وجیہ الدین صاحب سے ملاقات کی، اور ان کے مشورہ سے حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحبؒ کی خدمت میں بیعت کی درخواست کے لئے خط بھیجا، (یہ زمانہ ہندو پاک کی جنگ کا زمانہ تھا، شاید اس لئے لاہور سے کراچی کا سفر مشکل تھا) وہاں سے جواب آیا کہ'' آپ کو غائبانہ بیعت کر لیا گیا ہے''۔ اور بقول حضرت: ''یہ مژدۂ جاں فزا ان کے لئے ایک نئی زندگی کی خوشخبری لایا''۔

شیخ وجیہ الدین سے تربیتی رابطہ

اس کے بعد تقدیر الٰہی نے ایک کرم اور یہ کیا کہ ہمارے ممدوح کو خود لاہور کی اسی انجینئر نگ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا جہاں یہ شیخ وجیہ الدین انجینئر نگ کے پروفیسر تھے —— ویسے تو یہ اُن کے پیر بھائی ہی تھے، مگر راہ سلوک میں وہ بہت اگلے مراحل پر تھے —— مادی اور روحانی دونوں قسم کی انجینئر نگ کے اس حوصلہ مند نوجوان طالب علم نے ان کی شاگردی صرف انجینئر نگ ہی میں نہیں، بلکہ سلوک میں بھی اختیار کر لی —— شیخ وجیہ الدین کی تربیت کا رنگ ان کے شاگردوں پر کس طرح چڑھا کرتا تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''انجینئر نگ یونیورسٹی لاہور میں آپ نے ایسے متبع سنت نوجوان ذاکرین کی جماعت تیار کی کہ شاید من حیث الجماعت پوری دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی''۔

ہمارے حضرت نے اپنے اِن استاذ و مربی کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، چند باتیں نمونے کے طور پر نقل کی جا رہی ہیں تا کہ ان کی شخصیت کے مقام اور ذوق و مزاج کا کچھ اندازہ کیا جا سکے:

☆ ''آپ بیع فاسد کے پھلوں سے پرہیز فرماتے ہیں، سوائے کیلا، گاجر، مولی یعنی وہ سبزیاں اور پھل جو بیع باطل کے زمرے سے خارج ہیں، انھیں استعمال فرماتے ہیں۔

☆ آپ بازار کی تیار کردہ کھانے پینے کی اشیاء مثلاً بسکٹ، امپورٹڈ دودھ، ڈبل روٹی، جام،

کولڈ ڈرنک، آئس کریم، روسٹ بروسٹ، اور مٹھائیوں وغیرہ سے مکمل پرہیز کرتے ہیں۔

☆ آپ میں عاجزی وانکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، گم نام رہ کر زندگی بسر کرنا آپ کا معمول ہے۔

☆ اپنے آپ کو شیخ صاحب کے الفاظ ہی سے پکارنے کی اجازت دیتے ہیں، اگر کوئی صاحب ''حضرت'' کا لفظ استعمال کریں تو فوراً ٹوک دیتے ہیں۔

☆ ایک مرتبہ آپ سائیکل پر یونیورسٹی میں جارہے تھے، ایک نووارد طالب علم نے آپ کو روک کر پوچھا: آپ کا کیا نام ہے؟ آپ نے فرمایا: وجیہ الدین، اس نے کہا کہ مجھے آپ فلاں جگہ چھوڑ دیں گے؟ آپ نے اس طالب علم کو پیچھے سائیکل پر بیٹھا لیا اور مطلوبہ جگہ پر چھوڑ آئے، اس کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ آپ یونیورسٹی کے ٹیچر ہیں۔

☆ راقم نے پانچ سال سفر وحضر میں دِن رات آپ کی صحبت میں رہ کر یہ نتیجہ نکالا کہ ''آسمان کی زینت ستاروں سے ہے، زمین کی زینت پرہیزگار انسانوں سے ہے...... پانچ سال کے عرصے میں راقم الحروف نے آپ سے ایک عمل بھی خلاف سنت سرزد ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، جو شخص بھی چندن آپ کی صحبت میں رہتا ہے، وہ دورنگی چھوڑ کر یک رنگی اختیار کرلیتا ہے'' (حیات حبیب ص ۶۸۹ تا ۶۹۵)

اصلاح وتکمیل کی مسلسل کوشش اور اسفار

انجینئرنگ کے آخری سال کا امتحان دینے کے بعد ہمارے ممدوح نے جو اُن دنوں ایک نوجوان تھے، سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے عظیم بزرگ حضرت خواجہ فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں چار ماہ کا عرصہ گذارا، جہاں روزانہ سات گھنٹے مراقبہ کرنے کا معمول تھا، اس کے بعد صرف اس مقصد سے کراچی کا رخت سفر باندھا کہ وہاں ایک دوست کے یہاں قیام کرکے اپنے شیخ حضرت مولانا زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری ہوتی رہے گی، اس زمانہ میں وہ اپنی مشہور ومعتبر کتاب ''عمدۃ الفقہ'' کی تالیف فرمارہے تھے، کراچی کے قیام کے دوران معمول یہ رہا کہ صاحبِ خطبات اپنی رہائش گاہ پر سارا دن ذکر ومراقبہ میں لگے رہتے اور عصر کے بعد حضرت شاہ صاحب کے یہاں حاضری ہوتی، حضرت شاہ صاحب مجددی علوم ومعارف کے زبردست ماہر تھے، انھوں نے حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات کا ترجمہ بھی کیا ہے، چنانچہ اس موقع کو غنیمت جان کر حضرت نے یہ معمول بنالیا کہ دن میں مکتوبات کا مطالعہ کرتے اور عصر کے

بعد کی مجلس میں حضرت شاہ صاحب سے مشکل مقامات کے بارے میں سوالات کرتے۔ کچھ عرصہ اس طرح اپنے شیخ کی صحبت میں گذارنے کے بعد حضرت کراچی سے اپنے وطن واپس پہنچے اور وہاں ملازمت کے ساتھ ساتھ حفظ قرآن اور عربی و دینی تعلیم کی تکمیل میں لگ گئے۔

بیعت ثانی

حضرت سید زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد اپنی اصلاح کی فکر و طلب نے حضرت کو حضرت مولانا شاہ غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں تک پہنچا دیا، جو چکوال کو اپنا مستقر بنا کر قرب و جوار اور دور دراز کے علاقوں تک بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں دین کی تبلیغ و اشاعت اور اہل طلب کی تعلیم و تربیت کے نبوی کام میں دِن رات مصروف رہتے تھے ـــــ ہمارے حضرت نے اِس بیعت کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے:

"راقم نے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات حسرت آیات کے بعد استخارہ کیا تو تجدید بیعت کے لئے حضرت مرشد عالم (مولانا شاہ غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ) کی طرف توجہ مائل ہوئی، راقم نے حضرت مرشد عالم کو دس سال پہلے مسکین پور شریف کے اجتماع پر دیکھا تھا اور بیان بھی سنا تھا، چنانچہ راقم دل گرفتہ پیوستۂ منزل ہونے کی آرزو میں چکوال پہونچا، اس وقت مسجد کی توسیع کا کام جاری تھا اور نئی بنیاد کھودی جا رہی تھی، استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت مرشد عالم تو مری گئے ہوئے ہیں، کل واپس آئیں گے۔ حضرت مرشد عالم اگلے دن عصر کے بعد تشریف لائے، اہل خانہ نے اطلاع دی تو راقم کو بلوایا اور پوچھا کیسے آنا ہوا؟ عرض کیا "حضرت! میں یتیم ہو گیا ہوں، اور یہ کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا، راقم اس درد سے رویا کہ حضرت مرشد عالم بھی آبدیدہ ہو گئے، فرمایا بیعت کن سے تھی؟ عرض کیا حضرت سید زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے، فرمایا ان کی نسبت قوی اور صحیح تھی۔ پھر پوچھا خود آئے ہو یا کسی نے بھیجا ہے؟ عرض کیا خود آیا ہوں، استخارہ کیا تھا، دس سال پہلے آپ کی زیارت بھی کی تھی، بیان بھی سنا تھا، بہت متأثر بھی ہوا تھا، فرمایا اگر متأثر ہوئے تھے تو پھر ملے کیوں نہیں؟ عرض کیا حضرت توجہ کا قبلہ ایک ہی تھا، دوسری طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تھا، فرمایا ماشاء اللہ ایسے ہی ہونا چاہئے ـــــ چنانچہ حضرت مرشد عالم نے بیعت فرمایا..

(حیات حبیب ص ۷۵۰-۷۵۱)

حضرت شاہ غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ احوال

جی تو چاہتا ہے کہ اِس موقع پر مرشد عالم حضرت مولانا شاہ غلام حبیب صاحب قدس اللہ سرہ کے تفصیلی احوال ذکر کئے جائیں، مگر صفحات کی گنجائش محدود ہے۔

اہل ذوق حضرات ''حیات حبیب'' کا مطالعہ کرلیں، تاہم اسی کتاب سے مختصراً کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

سلسلۂ نسب:

ہمارے صاحب خطبات کے بیان کے مطابق حضرت شاہ غلام حبیب صاحب کا سلسلۂ نسب ۳۴ واسطوں سے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

تعلیمی سلسلہ:

آپ کے والد ماجد بچپن ہی سے آپ کو حافظ کہہ کر مخاطب کرتے، جب کہ آپ کی والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا کے دل میں بھی یہی شوق انگڑائیاں لیتا تھا............ آپ نے اپنے لڑکپن ہی میں علاقے کے معروف استاذ حضرت قاری قمرالدین رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن پاک حفظ کیا...... آپ نے علمی کتابیں اپنے چچازاد بھائی شیخ الحدیث حضرت مولانا سید امیر رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں، جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ ساتھ ''درجوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری'' کا مصداق بھی تھے، آپ کا علمی ذوق وشوق دیکھ کرانھوں نے مروجہ نصاب کے بجائے چیدہ چیدہ کتابیں ایسے انداز سے آپ کو پڑھائیں کہ آپ کا سینہ علم نافع کا خزینہ بن گیا۔''

حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب اور
حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہما سے تلمذ کا شرف

ہمارے اہل علم ان دونوں حضرات کے علمی وروحانی مقام بلند سے بخوبی واقف ہیں، خصوصاً فہم قرآن میں اور عقیدۂ توحید میں صلابت کے ساتھ کامل اتباع رسول میں ان دونوں حضرات کا مقام بہت بلند بتایا جاتا ہے۔ حضرت مولانا شاہ غلام حبیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے تو مدتوں حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب[1] رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ کر تفسیر قرآن کا درس لیا، جو براہ راست حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

کے شاگرد تھے اور عقیدۂ توحید میں صلابت اور تفسیر قرآن میں ممتاز مقام رکھتے تھے، پھر ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کیا، ان دونوں حضرات کی محبت اور توجہات نے ان کے سینے میں علم اور عشق کی جامعیت، عقیدۂ توحید پر پختگی نیز دین کی اشاعت واقامت کا بے پناہ جذبہ بھر دیا اور اکابر دارالعلوم دیوبند کے مسلک ومشرب سے گہری اور مبنی بر بصیرت وابستگی کی دولت بخشی۔

بیعت وارادت:

حضرت شاہ غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ کو شروع ہی سے اپنے چچازاد بھائی مولانا سید امیر رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں ایک صاحبِ نظر اور انتہائی خیر خواہ مربی مل گئے تھے، انھوں نے اپنے اس بھائی اور شاگرد کے دل میں محبت الٰہی اور صحبت صالحین کے جذبات کے بیج بچپن ہی میں ڈال دئے تھے۔ پھر وقت آنے پر وہ خود حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں انھیں لے کر حاضر ہوئے اور بیعت کرایا۔۔۔۔اس کے بعد سے حضرت شاہ غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ذوق وشوق، والہانہ جذبے اور شدید محنت کے ساتھ سلوک کے معمولات پورے کرنے شروع کردئے، اور بہت جلد وہ اپنے شیخ کے انتہائی منظور نظر ہو گئے اور پھر وہ وقت آیا کہ حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقیؒ نے انھیں ''تکمیل وتصدیق'' کے لئے اپنے شیخ حضرت خواجہ فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا، جنھوں نے اشارہ پاکر انھیں سلسلہ عالیہ کی اجازت وخلافت مرحمت فرمائی۔ اسی موقع پر ایک اور صاحب کو بھی اجازت وخلافت دی گئی تھی، ان کا نام تھا جناب غلام حیدر معروف بہ حافظ بڈھن خاں۔۔۔۔ جنھوں نے بعد میں اپنا ایک خواب حضرت خواجہ فضل علی قریشیؒ کو سنایا، انھوں نے کہا حضرت! میں نے چند دن پہلے یہ خواب دیکھا کہ آپ مجھے بھی خلافت دے رہے ہیں اور ایک شخص کو بھی جس کا نام ''باغ علی'' ہے..... یہ سن کر حضرت قریشیؒ مسکرائے اور اپنا داہنا ہاتھ شاہ غلام حبیبؒ کے کندھے پر رکھ کر فرمایا: ''یہی علی کا باغ ہے، یہی علی کا باغ ہے.....''

حضرت شاہ غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے چند اہم پہلو

ا۔ دینی حمیت اور مجاہدانہ مزاج:

حضرت شاہ غلام حبیبؒ نے شروع سے جن علماء سے استفادہ کیا تھا، ان کی صحبت وتلمذ کی برکت سے ان کے اندر عقیدۂ توحید میں صلابت، بدعات سے نفور اور امت کی اصلاح کی فکر سرایت کرگئی تھی، چنانچہ جیسے ہی وہ اپنے آبائی گاؤں سے وعولہ (ضلع چکوال) منتقل ہوئے، انھوں نے عام لوگوں کے

عقائد واعمال کی اصلاح ہی کے مقصد سے جگہ جگہ درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا، اور ایک مدرسہ عربیہ حبیبیہ کی داغ بیل ڈالی ــــــ اس کے بعد ایک وقت آیا کہ چکوال کے کچھ لوگوں نے آپ کو درس قرآن کے لئے مدعو کیا، دوران درس جب آپ نے صاف لفظوں میں بدعات کے رد میں بولنا شروع کیا تو سامعین میں سے کچھ لوگوں نے آپ کے ہاتھوں سے قرآن مجید چھین لیا، آپ کو منبر سے اتار دیا اور طوفان بدتمیزی بپا کیا ــــــ اس کے بعد آپ نے فیصلہ کرلیا کہ اب چکوال میں ہی کام کرنا ہے کہ یہاں ضرورت زیادہ ہے، چنانچہ آپ نے چکوال میں ایک صاحب کے یہاں قیام کیا جو آپ سے مانوس تھے، چندروزہ قیام کے بعد پتہ چلا کہ سرکاری کالج کے قریب ایک مسجد ویران پڑی ہے، بس آپ وہاں گئے، خود صفائی کی اور نماز قائم کی۔ وہاں آہستہ آہستہ کالج کے کچھ نوجوان آنے لگے، جن کے درمیان آپ نے قرآن کا درس دینا شروع کیا۔ جس کے ذریعہ ایک چھوٹی سی جماعت بن گئی۔ مگر یہ مسجد شہر سے دور تھی، اور اہل شہر کی اصلاح کا کام یہاں بیٹھ کر حسب منشا نہیں ہو پارہا تھا، اسی دوران آپ کو پتہ چلا کہ شہر میں ایک اور چھوٹی سی مسجد ہے جو غیر آباد ہے، آپ نے اس مسجد میں نماز کا سلسلہ شروع کردیا، بقول صاحب خطبات:

> ''آپ نے بنفس نفیس اس مسجد کو گندگی ونجاست سے پاک صاف کیا اور نماز باجماعت کا اجراء کیا، مسجد کا نیا نام ''مسجد دارالعلوم حنفیہ'' رکھا، ابتداء میں آپ ہی مؤذن، آپ ہی مکبر، آپ ہی مقتدی، آپ ہی امام ہوتے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں اذان دے کر نمازیوں کے انتظار میں بیٹھ جاتا، جب کافی دیر گذرنے کے بعد بھی کوئی نہ آتا تو میں اپنی نماز پڑھ لیتا اور ذکر ومراقبہ کا اہتمام کرتا ــــ آپ کی دعائیں رنگ لائیں اور ایک دو نمازیوں نے مسجد میں آنا شروع کردیا، آپ نے درس قرآن پاک کا سلسلہ جاری کردیا تو نمازیوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا.....'' (حیات حبیب ص ۱۱۲)

عمومی اصلاح کے لئے مسلسل اسفار:

دور دور سے تماشا دیکھنے اور تبصرہ کرنے والے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف وسلوک کے مزاج میں امت کی عمومی اصلاح کی فکر وسعی نہیں ہے ــــ پوری تاریخ دعوت واصلاح گواہ ہے یہ بات سراسر غلط ہے اور صرف جہالت پر مبنی ہے ــــ حضرت شاہ غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ کا جس سلسلہ سے تعلق تھا، اس سلسلہ کے تمام مشائخ بھی اپنے اپنے دور میں گاؤں گاؤں، قریہ قریہ عمومی اصلاح کے لئے مسلسل سفر کرتے تھے

۔اور اپنے خلفاء کو بھی عمومی اصلاح کے کام کی سخت تاکید کرتے تھے ۔یہی ذوق ومزاج حضرت شاہ غلام حبیبؒ کا بھی تھا۔صاحب خطبات گواہ ہیں کہ:

''آپ نے اِنِّی دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلاً وَّنَہَارًا '' (بیشک میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن) کی یادیں تازہ کردیں۔دین کے کاموں میں تھکنا آپ کو آتا ہی نہ تھا، جہاں کہیں سے تقاضا آتا تو آپ اپنے ذاتی تقاضوں کو قربان کرکے (اِنْفِرُوْا خِفَافاً وَّثِقَالاً نکلو ہلکے اور بوجھل) پر عمل پیرا ہوتے ہوئے وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِهَادِہٖ (اور محنت کرو اللہ کے واسطے جیسے کہ چاہئے اس کے واسطے محنت) کی بلندیوں کو چھو لیتے ۔آپ کے سیماب صفت قلب کو احیائے دین کا غم چین وآرام نہ لینے دیتا تھا........'' (حیات حبیب ص ۲۲۶)

قرآن سے والہانہ شغف اور غیر معمولی مناسبت

حضرت شاہ غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ماہرفن اور عاشق قرآن اساتذۂ کرام سے تفسیر قرآن کا علم حاصل کیا تھا، کہ خود ان کی رگ وپے کے اندر قرآن کا علم وفہم اور اس کے عشق کا نور بھی سرایت کر گیا تھا،ان کا ہر بیان بے شمار آیات قرآنی سے مزیّن ہوتا تھا،ایک آیت پڑھتے تھے، پھر اس کی تشریح کے لئے دوسری آیت پڑھتے تھے، پھر تیسری، چوتھی .... .اس طرح پورا بیان تفسیر قرآن بالقرآن کا شاندار نمونہ ہوتا تھا۔صاحب خطبات نے اپنے شیخ ومرشد کے اس کمال کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

''دورانِ بیان آپ قرآن پاک کی آیات دلیل کے طور پر اس روانی سے پیش فرماتے جیسے کہ موتیوں کی مالا ٹوٹ پڑی ہو اور موتی تواتر سے گر رہے ہوں۔

تفسیر قرآن بالقرآن کے معاملے میں آپ کی نظیر نہیں ملتی تھی ۔آپ فرماتے تھے''جیسے ٹی وی چلتا ہے اور لوگ سامنے بیٹھے تصویریں دیکھتے رہتے ہیں،اسی طرح دوران تقریر میرے سامنے قرآن پاک کا ٹی وی چل پڑتا ہے اور میں آیتیں دیکھتا رہتا ہوں''

(حیات حبیب ص ۳۹)

آپ کا اپنی زندگی کے زیادہ تر ایام میں روزانہ بعد نماز فجر درس قرآن کا معمول رہا۔ایک مرتبہ آپ کو دربار نبوت سے بھی یہ اشارہ ملا کہ ''ہمیں تمہارا قرآن بہت پسند ہے'' اس کے بعد تو آپ نے اور زیادہ پابندی اور اہتمام بڑھایا۔آپ کے درس قرآن سے بلا مبالغہ لاکھوں لوگوں کی اصلاح ہوئی

۔صاحبِ خطبات راوی ہیں کہ:

''حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ''آپ کا درس قرآن سنتے تو عش عش کر اٹھتے اورفرماتے: اس دور میں اگر کسی نے قرآن کو سمجھا ہے تو حضرت مولانا پیر غلام حبیب صاحب نے سمجھا ہے''۔ (حیات حبیب ص ۴۴۶)

معاصر اکابر و مشائخ سے تعلق

حضرت مولانا شاہ غلام حبیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا محبت واحترام پر مبنی رابطہ ہمارے اکابر میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بہت قریبی تھا، ان کے ساتھ حج بھی کیا تھا، پھر ان کی وفات پر تعزیت کی نیت سے وہ سفر کر کے مرکز نظام الدین تشریف لائے ،اور وہاں سے ایک جماعت کے ساتھ کلکتہ کا سفر کیا۔ حضرت مولانا عبدالغفور نقشبندی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت خواجہ فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں تھے، ان سے بھی بہت گہرا تعلق تھا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے بارہا آپ کی ملاقاتیں مدینہ منورہ میں ہوئی تھیں۔ بلکہ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ حضرت شیخؒ جس مدرسۃ العلوم الشرعیۃ میں قیام فرماتے تھے ،اسی کے بالائی منزل والے کمرے میں آپ حضرت شاہ غلام حبیبؒ کے قیام کا بندوبست کروادیتے تھے، صاحب خطبات نے لکھا ہے:

''آپ کو حضرت شیخ الحدیثؒ سے اتنی محبت تھی کہ مجالس میں تذکرہ کرتے ہوئے وفور محبت میں آبدیدہ ہوجاتے تھے، جب حضرت شیخ الحدیث کی وفات حسرت آیات کی جان کاہ خبر ملی تو آپ بہت دیر تک انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے رہے ، اور آپ پر ایسی کیفیت طاری تھی جیسا کہ افراد خانہ میں سے کسی نے داعی اجل کو لبیک کہا ہو۔'' (حیات حبیب ص ۱۸۰)

مشہور محدث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو بھی آپ سے بے حد محبت وعقیدت تھی ، جب بھی آپ کراچی میں ہوتے تو حضرت بنوریؒ آپ سے اپنے مدرسہ کے لئے پروگرام طلب فرماتے تھے، طلبہ کو بار بار تاکید فرماتے کہ وہ آپ سے باطنی رشتہ استوار کر کے اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آپ کو شدید محبت تھی ۔اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے آپ ایک بار تھانہ بھون بھی تشریف لے گئے تھے۔

صاحب خطبات کی شخصیت کا ایک اہم پہلو:

علم، عقل اور عشق کی جامعیت:

حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو اجازت و خلافت دی تھی، اس وقت ان سے کہا تھا:

''باری تعالی ترا علم و عقل و عشق عطا فرمودہ است''

(باری تعالی نے تم کو علم، عقل اور عشق عطا فرما دیا ہے۔)

ہمارے صاحب خطبات کی شخصیت کا قریب سے مطالعہ کرنے پر صاف نظر آتا ہے کہ بلاشبہ ان کی ذات میں بھی توفیق الٰہی نے مذکورہ بالا تینوں صفات جمع فرما دی ہیں—— علم کا حال یہ ہے کہ وہبی اور کسبی دونوں طرح کے علوم ان کے پاس جمع ہیں۔ ان کی راتوں کا بیشتر حصہ کتابوں کے مطالعہ میں گذرتا ہے۔ ان کا ہر بیان سیکڑوں صفحات کے مطالعے کا نچوڑ ہوتا ہے—— وہ طلبہ اور طالبات کے کئی کئی مدارس دنیا کے مختلف ملکوں میں چلا رہے ہیں۔ ایسے پروفیشنل نوجوانوں کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے جو ان سے وابستہ ہونے کے بعد پورے درس نظامی سے فارغ ہوئے، وہ ذکر کے ساتھ ساتھ علم پر بے حد زور دیتے ہیں۔ خود حدیث کی مشہور کتاب شمائل ترمذی کا درس دیتے ہیں جو طلبہ ہی میں نہیں علماء واساتذہ میں بھی بے حد مقبول ہے ابھی قریبی زمانے میں انہوں نے سورۂ یوسف کا درس مسلسل کئی مجلسوں میں دیا ہے، جس کا ذکرِ خیر اس عاجز نے بعض اہلِ علم سے سنا ہے۔ مختلف وقتی ضرورت کے موضوعات پر بھی ان کے علمی دروس کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے، مثلاً انکار تقلید کے رائج الوقت فتنے کے سد باب کے لئے انھوں نے درس کے حلقے منعقد کئے ہیں——

جہاں تک وہبی علم کا سوال ہے تو اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا مجھے اپنی حدود سے تجاوز معلوم ہوتا ہے اور ان کے افکار و تعبیرات اس کے شاہدِ عدل ہیں۔

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری صفت عقل بیان کی ہے۔ تو اس کا گواہ ہر وہ شخص ہے جس نے ان سے نجی معاملات میں رہنمائی طلب کی ہو یا اجتماعی معاملات میں، کہ عقل معاد اور عقل معاش دونوں سے اللہ نے ان کو خوب خوب نوازا ہے، اور بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اِن اللہ والوں کو صرف دماغ کی ذہانت نہیں ملتی، قلب اور روح کی ذہانت بھی ان کو ملتی ہے۔

اور رہ گیا عشق تو اس کی بابت یہ ہیچ مداں کچھ بھی عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا، اس لئے کہ پورا زمانہ اس بات کا گواہ ہے کہ اس دور میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب اور عرب و عجم ہر طرف ''دوائے دل'' کی تقسیم کا کام شاید سب سے زیادہ ان ہی سے لیا جا رہا ہے—

وذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

مبارکاھاًدیاللناس محتسباً علی الانام بلامنٍ ولاثمنٍ
یلقی الیہ رفاق الناس کلھم علی المحامل والاقتاب والسفن
یظل منعفراللّٰہ مبتھلا یدعوالالٰہ بقلب دائم الحزن

اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ ان کی شخصیت سازی میں ایک سے ایک بڑھ کر اہلِ دل شریک رہے ہیں ؎

کتنے عالم ہیں جو غنچے پہ گذر جاتے ہیں
تب کہیں جاکے وہ رنگین قبا ہوتا ہے

بس اب میں قلم روکتا ہوں، صاحب خطبات کی شخصیت کا تعارف کرانا میرے بس کی بات کہاں ہے کیونکہ

یہ رمزی بے بصیرت ہے تیرے رتبے کو کیا جانے
جو ہم رتبہ ہو تیرا وہی تیرے اوصاف پہچانے

اور ؎

گلچین بہار تو زتنگی داماں گلہ دارد

اور کیا خوب ہو کہ اہلِ ذوق ہما شما کی باتوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود قریب سے دیکھیں ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ اِن کو

بس اب مجھے درمیان سے ہٹ جانا چاہئے اب آپ ہیں اور حضرت کے ارشادات، پڑھئے اور فائدہ اٹھایئے! اور اپنی دعاؤں میں ہم سب کو یاد رکھئے۔

☆☆☆

ماہنامہ الفرقان کے خریداروں سے ایک اہم گذارش

''خریداری نمبر'' اور ''مدت خریداری'' سے متعلق

☆ کیا آپ کو اپنا خریداری نمبر (Subscription No.) اور آپ کی مدتِ خریداری (Subscription validity) معلوم ہے؟؟؟؟ اگر نہیں تو فوراً معلوم کریں، اور اسکو نوٹ کر کے اپنے پاس محفوظ کرلیں۔۔۔۔ اسی طرح مدتِ خریداری کب ختم ہورہی ہے؟ اس بات کو بھی محفوظ کرلیں؛ تاکہ آپ مدت خریداری کے ختم ہوتے ہی زرِتعاون فوری طور پر بغیر کسی تاخیر کے ارسال کرسکیں۔۔۔۔۔

''زرِتعاون'' ارسال کرنے اور VP سے متعلق

☆ مدتِ خریداری ختم ہوتے ہی جلد از جلد بلا تاخیر اپنا چندہ روانہ فرمادیں۔۔

☆ اگر آپ بذریعہ منی آرڈر اپنا زرِتعاون بھیج رہے ہیں، تو پیغام کی جگہ پر اپنا پورا پتہ صاف صاف لکھیں، پن کوڈ ضرور درج کریں، ساتھ ہی ساتھ فون نمبر بھی لکھیں، جو حضرات EMO (Electronic money order) کے ذریعہ زرِتعاون ارسال کرتے ہیں وہ حضرات اپنا خریداری نمبر ضرور ارسال فرمائیں، کیونکہ EMO میں پتہ پرنٹ ہونا مشکل ہوتا ہے، اس لئے اپنا خریداری نمبر ضرور درج کردیں۔ تاکہ آپ کو VP کے ذریعہ رسالہ نہ روانہ کیا جائے۔۔۔
کیونکہ تاخیر کی صورت میں اگر اطلاع نہیں کی گئی تو مقررہ تاریخ میں رسالہ بذریعہ VP روانہ کردیا جائے گا، اِس بیچ اگر آپ نے زرِتعاون بھیج دیا، اور VP بھی یہاں سے روانہ ہوچکی، تو VP کے مزید Rs.35 آپ پر بار ہوگا، اور اگر آپ نے VP واپس کردی تو الفرقان کو فی شمارہ Rs.40 کا نقصان ہوتا ہے۔

☆ اگر کسی وجہ سے مدتِ خریداری کے ختم ہوتے ہی آپ زرِتعاون ارسال نہیں کرپائے، اور تاخیر کی اطلاع بھی دفتر میں نہیں کرسکے، تو فوری طور پر آفس فون کر کے اپنا خریداری نمبر بتا کر معلوم کرلیں کہ میرا رسالہ بذریعہ VP روانہ ہو چکا یا نہیں؟ اگر نہیں! تو فوراً اپنا تعاون ارسال فرمائیں۔۔۔ اگر VP روانہ کی جاچکی ہے تو اب صرف VP کا انتظار فرمائیں۔
اور VP پہونچنے پر اسکو ضرور حاصل کرلیں، واپس نہ کریں تاکہ آپ کی وجہ سے ادارۂ الفرقان کا نقصان نہ ہو۔

☆ اگر آپ نے صحیح وقت پر زرِتعاون روانہ کردیا، مگر کسی وجہ سے وقت پر وہ الفرقان نہیں پہونچا، یا اسکی اطلاع الفرقان نہ پہونچ سکی، اور الفرقان سے VP آپ کو روانہ کردی گئی، تو ہماری درخواست ہے کہ آپ اُس VP کو وصول فرمالیں، اس صورت میں آپ کی مدت خریداری میں دوسال کا اضافہ ہوجائے گا۔ البتہ آپ VP واپس کرنے میں حق بجانب تو ہوں گے، مگر بہر حال الفرقان کو Rs.40 کا نقصان ہوگا۔

غیر ضروری سمجھ کر آپ اس صفحہ کو نظر انداز نہ کریں،

ناظم شعبہ رابطۂ عامہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی**

بزرگوں کے بارے میں چندروایات (۱) کی تحقیق

[۲۸ ستمبر کو ممتاز عالم وفقیہ مولانا عتیق بستوی قاسمی صاحب کا ایک مضمون اس عاجز کو موصول ہوا جس میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت کے ایک خطاب (شائع شدہ: الفرقان: مئی، جون ۲۰۱۱ء) کے چند علمی تسامحات کا تذکرہ کیا ہے۔۔حسنِ اتفاق سے اگلے ہی دن یہاں، معہد الامام ولی اللہ الدھلوی، خانقاہ نعمانیہ میں حضرت کے زیادہ تر خلفاء باہم مشوروں کے لئے جمع ہونے والے تھے، چنانچہ راقمِ سطور نے وہ مضمون سب حضرات کی خدمت میں پیش کر دیا، اس کے مطالعہ کے بعد سب کی رائے یہی ہوئی کہ اسے مولانا کے شکریہ کے ساتھ ضرور شائع کیا جائے، البتہ بہتر یہ ہوگا کہ اشاعت سے پہلے حضرت کی نظر سے بھی یہ گذر جائے، اس رائے کی وجہ غالباً یہی تھی کہ سب کو حضرت کے مزاج کے حوالے سے یہ یقین تھا کہ حضرت خود اسے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ البتہ چونکہ اس صورت میں اس کی اشاعت میں کچھ تاخیر لازمی تھی، اس لئے میں نے از راہِ احتیاط محترم مولانا عتیق احمد صاحب کو بھی بذریعہ خط اس رائے سے مطلع کرتے ہوئے ان کا عندیہ بھی لینا چاہا، انہوں نے جواباً لکھا:

> ''اشاعت میں ایک ماہ کی تاخیر کوئی اہم بات نہیں ہے۔ مضمون ایسا نہیں ہے کہ ایک دو ماہ آگے یا پیچھے شائع ہونے سے اس کی افادیت پر کوئی اثر پڑے، آپ الفرقان کے دسمبر ۲۰۱۱ء کے شمارہ میں اسے شائع فرمائیں۔''

---

(۱) حضرت مولانا پیر ذوالفقار نقشبندی کے ایک خطاب کی چندروایات کا جائزہ

** استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماءؒ بانی ومدیر معہد الشریعۃ، لکھنؤ

چنانچہ مولانا کا مضمون میں نے محترم مولانا سید محمد طلحہ صاحب اور مولانا صلاح الدین سیفی صاحب (دونوں حضرات حضرت کے معروف خلفاء میں ہیں) کے بدست حضرت والا کی خدمت میں مکہ مکرمہ ارسال کر دیا تھا، جہاں حضرت سے ان دونوں حضرات کی ملاقات حج کے پہلے یا بعد متوقع تھی، ایام حج گذر جانے کے بعد میں بے چینی سے اس سلسلے میں کسی اطلاع کا انتظار کر رہا تھا، اور آج (بتاریخ ۱۶ نومبر) جب میں مولانا عتیق صاحب کے مضمون کو اشاعت کے لئے تیار کرنے کے بعد نمازِ ظہر قیلولہ کے ارادہ سے لیٹا ہی تھا کہ محترم مولانا صلاح الدین سیفی صاحب نے مکہ مکرمہ سے بذریعہ فون یہ خوش خبری سنائی کہ حضرت نے مولانا کا مضمون اور اس عاجز کا عریضہ ملاحظہ فرمالیا اور ایک تفصیلی مکتوب تحریر فرمایا ہے جو ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو ای میل کے ذریعہ مل جائے گا۔ اور واقعۃً تھوڑی ہی دیر بعد حضرت کا وہ مکتوبِ گرامی، محترم بھائی مصطفیٰ کمال صاحب (خلیفۂ حضرت والا دامت برکاتہ) کی عنایت سے موصول ہوگیا۔ اب آپ پہلے تو اصل مضمون کا مطالعہ کرلیں اس کے بعد متصلاً "الفرقان کی ڈاک" کے زیر عنوان حضرت کا وہ مکتوب ملاحظہ فرمائیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ ان سب تحریروں کو مختلف پہلوؤں سے بہت مفید اور سبق آموز پائیں گے ——— مدیر]

ماہ اپریل ۲۰۱۱ء میں پاکستان کے معروف صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا ذوالفقار نقشبندی دامت برکاتہم حضرت مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی زید مجدہم مدیر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، اور حضرت مولانا محمود مدنی صاحب زید مجدہم (جنرل سکریٹری جمیعۃ علماء ہند) کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے، ہندوستان کے مختلف شہروں (بمبئی، حیدرآباد، دیوبند، ترکیسر، دہلی وغیرہ) میں ان کی مجالس اور بیانات ہوئے، الفرقان لکھنؤ کے شمارہ (مئی، جون ۲۰۱۱ء، جمادی الاخریٰ رجب ۱۴۳۲ھ) میں مدیر الفرقان کے قلم سے نگاہ اولیں میں حضرت مولانا پیر ذوالفقار نقشبندی کے سفر ہندوستان اور ان کے پروگراموں کی کچھ تفصیل ہے، اور الفرقان کا یہ شمارہ گویا انہیں کے بیانات اور ان کے سفر ہند کی تفصیلات کے لئے وقف ہے۔

۱۱/اپریل ۲۰۱۱ء کو دارالعلوم دیوبند کی مسجد رشید میں بعد نماز عشاء پیر صاحب کا جو بیان ہوا اس میں دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کے ذمہ داران، دارالعلوم کے اساتذہ وطلبہ کے علاوہ دیگر مدارس کے اساتذہ

وطلبہ اور عام اہل علم کی کثیر تعداد شریک تھی، مرتبِ تقریر کے بقول ''محتاط اندازے کے مطابق بیس ہزار سے زائد کا مجمع تھا''۔

مولانا ذوالفقار نقشبندی دامت برکاتہم کا یہ خطاب ''بارگاہ خداوندی میں قابلیت سے زیادہ قبولیت کا اعتبار'' کے عنوان سے ماہنامہ الفرقان کے ۲۶ صفحات (۴۶-۷۱) میں شائع ہوا ہے، خطاب بہت سی موثر اور مفید باتوں پر مشتمل ہے اور مجموعی طور پر پُرتاثیر ہے، اس خطاب میں بزرگان دین خصوصاً اکابر دیوبند کے بہت سے واقعات اور تاریخی باتیں بھی ہیں لیکن ان واقعات اور تاریخی باتوں کے ذکر میں متعدد تسامحات ہیں جن کی نشاندہی اور تصحیح ازحد ضروری ہے۔

ایک اہم تنبیہ:

آج کل بزرگان دین اور مشائخ طریقت کے بیانات، ملفوظات اور مکتوبات کی اشاعت کا رواج کافی بڑھ گیا ہے اور اس کی فی الجملۃ افادیت بھی ہے، ہر شیخ کے خلفاء اور اصحاب حلقہ اپنے شیخ کے افادات کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا چاہتے ہیں اور اس میں ان کی نیت اشاعت دین ہی کی ہوتی ہے لیکن عموماً دیکھا یہ جارہا ہے کہ بسا اوقات ان خطابات، ملفوظات اور مکتوبات میں بہت سی رطب ویابس چیزیں شامل ہوتی ہیں جو علمی لحاظ سے بالکل غلط یا بہت کمزور ہوتی ہیں، کیونکہ نہ ہر شیخ محقق ہوتا ہے، نہ اسے اتنی فرصت ہوتی ہے کہ ہر بیان اور گفتگو سے پہلے پوری علمی تیاری کرے اور معتبر ومستند چیزیں ہی لوگوں کے سامنے بیان کرے، اس کے حافظہ میں معلومات کا جو ذخیرہ پہلے سے جمع ہوتا ہے اسی کی مدد سے وہ اپنا خطاب ترتیب دیتا ہے اور افادہ وافاضہ کی محفلیں گرم کرتا ہے اور (بسا اوقات) انسان کے ذہن میں بہت سی سنی سنائی اور خلاف تحقیق ایسی باتیں ذہن نشین رہتی ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

بزرگان دین اور مشائخ طریقت کے خطابات، ملفوظات اور مکاتیب کو شائع کرنے والوں کی ذمہ داری ہے ان میں درج روایات، واقعات اور قصص کی علمی طور پر پوری تحقیق کرنے کے بعد ہی ان کی اشاعت کریں، خود زندہ بزرگوں اور مشائخ کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ اپنے خطابات ملفوظات وغیرہ کی اشاعت سے پہلے علمی طور پر ان کے مندرجات کو پرکھنے یا پرکھوانے کی کوشش کریں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس سلسلے میں بہترین نمونہ ہیں، انہوں نے بعض محقق اہل علم کو اپنی چیزوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے لئے مقرر فرمایا اور حضرت کو اگر کوئی شخص ان کی کسی غلطی پر متوجہ کرتا تو اس سے خوش ہوتے اور

پورے جذبۂ حق پرستی کے ساتھ علمی تنقیدوں کو قبول فرماتے اور ان کی اشاعت فرماتے۔

اس دور میں بزرگوں کے بیانات اور ملفوظات کی حیثیت وقتی نہیں ہے کہ جس محفل میں وہ خطاب ہوا یا وہ باتیں بیان کی گئیں وہیں تک محدود رہیں، بلکہ عموماً خطابات اور ملفوظات کی ریکارڈنگ ہوتی ہے، ان کی سی ڈیز بنتی ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں یا تقسیم کی جاتی ہیں، انہیں لاکھوں لوگ سنتے ہیں اور انہیں نوٹ کر کے رسالوں یا کتابوں کی صورت میں میں بڑے پیمانے پر شائع کیا جاتا ہے، اس طرح ان خطابات اور ملفوظات کی معلومات اور مشتملات کی رسائی لاکھوں انسانوں تک ہوتی ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، لہذا اس کی شدید ترین ضرورت ہے کہ انہیں شائع کرنے اور عام کرنے سے پہلے انہیں علم وتحقیق کی میزان پر ٹھیک ٹھیک تول لیا جائے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مطبوعہ رسائل، کتابیں اور فروخت ہونے والی سی ڈیز صرف مریدین اور معتقدین تک یا اپنے حلقے تک محدود نہیں رہتیں بلکہ مخالفین اور معاندین اور غیر جانبدار لوگوں تک بھی وہ چیزیں پہنچتی ہیں، اس طرح ہم ان میں کمزور چیزیں شامل کر کے اپنے مخالفین کو ہتھیار فراہم کرتے ہیں اور انہیں انگشت نمائی کا موقع دیتے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہم الفرقان میں شائع شدہ مذکورہ بالا خطاب کے چند تسامحات کی نشاندہی اس امید کے ساتھ کر رہے ہیں کہ ان کی تصحیح کر لی جائے گی اور دوسرے بیانات پر بھی اس پہلو سے نظر ڈال لی جائے گی۔

بانی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں چند تسامحات:

دارالعلوم دیوبند کی عظیم الشان مسجد جامع رشید میں دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام، معزز اساتذہ، عزیز طلبہ اور ہزاروں اہل علم کی موجودگی میں جو خطاب کیا گیا اس میں خود بانی دارالعلوم دیوبند قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں متعدد خلاف واقعہ باتیں شامل ہیں، معلوم نہیں کہ خطاب کے بعد مؤقر اساتذہ اور اہل علم میں سے کسی نے اس جانب متوجہ کیا کہ نہیں، پہلے ہم خطاب کا متعلقہ حصہ نقل کرتے ہیں، پھر اپنی معروضات پیش کرتے ہیں۔

> ''اب اگلی بات سنئے! حضرت نانوتوی شاہجہانپور مباحثہ کے لئے گئے، جہاں
> مختلف مذاہب کے لوگ آئے ہوئے تھے اور ہر ایک کو اپنے مذہب کی صداقت کو

ثابت کرنا تھا، تو حضرت نانوتویؒ نے الحمدللہ دین اسلام کی صداقت کو ایسا واضح کیا کہ سب لوگوں نے مانا کہ واقعی ان کی بات سب سے اعلیٰ ہے، جب انہوں نے مذاہب باطلہ کا بطلان ثابت کر دیا اور حضرت گنگوہی کو اس کامیابی کا علم ہوا تو حضرت گنگوہی کی آنکھوں میں آنسو آپڑے، پوچھا حضرت! کامیابی کی بات سن کر رو کیوں پڑے؟ تو حضرت گنگوہی نے فرمایا: مجھے لگتا ہے کہ میرا دوست اب مجھ سے جدا ہو جائے گا اور پھر فرمایا: اسے جس کام کے لئے اللہ نے پیدا کیا تھا وہ کام انہوں نے کر دیا، اللہ کی شان کہ اسی سال حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کا انتقال ہو گیا......''

(الفرقان مئی، جون ۲۰۱۱ء ص: ۶۴)

حضرت نانوتوی کا سن وفات:

مباحثہ شاہجہانپور میں حضرت نانوتوی کی شرکت اور کامیابی پر حضرت گنگوہی کے جس تاثر کا ذکر کیا گیا ہے اس کے لئے حوالہ کی ضرورت تھی، میرے لئے یہ بالکل نئی چیز ہے، اگر حوالہ ذکر کیا گیا ہوتا تو اصل سے مراجعت کر کے اس تاثر کی پوری تفصیل معلوم ہو سکتی تھی، اصل قابل توجہ حضرت نقشبندی دامت برکاتہم کا یہ ارشاد ہے ''اللہ کی شان اسی سال حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کا انتقال ہو گیا''

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت وسوانح کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ چاند پور ضلع شاہجہانپور کا پہلا میلہ خدا شناسی جس میں حضرت نانوتوی نے شرکت فرمائی ۱۲۹۲ھ میں ہوا اور دوسرا میلہ ۱۲۹۴ھ میں ہوا، ان دونوں میلوں میں حضرت نانوتوی کی شرکت اور فتحیابی ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے ذکر کی ہے (ملاحظہ ہو: ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مرتبہ: مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی ص: ۲۱۰، ۲۱۱)

اور حضرت نانوتویؒ کی وفات تمام تذکرہ نگاروں کے مطابق ۴/ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو ہوئی (ملاحظہ ہو: حوالۂ بالا ص: ۲۲۳)

اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مباحثہ شاہجہانپور ہی کے سال حضرتؒ نانوتوی کی وفات ہوئی، شاہ جہانپور کے دوسرے مباحثہ اور حضرت نانوتویؒ کی وفات کے درمیان تقریباً تین سال کا فاصلہ ہے، ۱۲۹۵ء

میں دیانند سرسوتی سے مناظرہ کرنے کے لئے بھی حضرت نانوتوی رڑکی تشریف لے گئے تھے لیکن زبانی مناظرہ کی نوبت نہیں آئی اور مراسلت ہی پر مسئلہ ختم ہو گیا۔

حضرت نانوتویؒ کی تحشیۂ صحیح بخاری میں شرکت:

حضرت مولانا نقشبندی نے فرمایا ہے:

''حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری نے ۲۵/ پارے کا حاشیہ لکھا، اور باقی پانچ پارے جو تھے ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس کو مکمل کیا''

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کی تصحیح کردہ صحیح بخاری اور اس پر ان کے حواشی کی اشاعت ۱۲۶۰ھ میں شروع ہو کر ۱۲۶۴ھ میں مکمل ہوئی، اسی میں وہ پارے بھی تھے جن پر حضرت نانوتوی کے حواشی ہیں، حضرت نانوتویؒ کا یہ تحشیہ ان کے ابتدائی عمر کا کارنامہ ہے جب کہ ان کی عمر بیس، اکیس سال رہی ہوگی، لوگوں کو اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اتنے اہم کام کے لئے حضرت سہارنپوری نے ایک نوجوان عالم کو کیوں منتخب فرمایا۔

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری کی وفات سے تقریباً ۳۲/سال پہلے صحیح بخاری کا یہ نسخہ شائع ہو چکا تھا۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حضرت نانوتویؒ کی وفات حضرت سہارنپوریؒ کی زندگی میں ہو چکی تھی، دونوں کا سن وفات ۱۲۹۷ھ ہے، لیکن حضرت نانوتویؒ کی وفات ۴/ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ کو ہوئی اور حضرت سہارنپوری کی وفات ۷/ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو ہوئی، اس لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ حضرت نانوتویؒ نے حضرت سہارنپوری کی وفات کے بعد بخاری کے حواشی لکھے ہوں (ملاحظہ ہو: قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ص: ۷۰ تا ۷۸)

حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی:

''حضرت گنگوہی کا مقام مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کی نظر میں'' کے زیر عنوان درج ہے:

''حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی جو صاحب کشف بزرگ تھے اور ان کا کشف اتنا معروف تھا کہ ایک مرتبہ مولانا عبدالحیؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سفر میں قصر پڑھی، ان کے پاس پہنچے تو بغیر بتائے ان کو پتہ چل گیا کہ نماز

کیسے پڑھی اور ڈانٹ پڑی، ان کے پاس ایک مرتبہ مولانا احمد علی سہارنپوری......
ملنے کے لئے آئے تو حضرت نے پوچھا کہ آپ نے حاشیہ لکھا ہے؟ کہا: جی فرمایا
تمہارے حاشیہ میں فلاں جگہ پر غلطی ہے، کشفاً پتہ چل گیا، دیکھا تو واقعی اس جگہ پر
کتابت کی غلطی تھی'' (الفرقان: مئی، جون ۲۰۱۱ء ص: ۶۴، ۶۵)

حضرت گنگوہی اور حضرت گنج مرادآبادی کے بارے میں مذکورہ بالا اقتباس کے بعد مزید کچھ باتیں درج ہیں جن پر آگے گفتگو کی جائے گی، سردست مذکورہ بالا اقتباس کے دو مندرجات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحب کے سفر گنج مرادآباد اور سفر میں قصر نماز پڑھنے پر ڈانٹ پڑنے کی جو بات کہی گئی ہے اس کی حقیقت جاننے کے لئے ہم نے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی'' کی طرف رجوع کیا تو واقعہ کی درج ذیل تفصیل معلوم ہوئی۔

''نماز قصر کا ایک مسئلہ:

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں: -آپ نے عندالملاقات مولانا عبدالحی صاحب سے پوچھا: بھلا تم تو بڑے فقیہ ہو، ہدایہ کا حاشیہ تم نے خوب لکھا، یہ تو بتاؤ کہ تم نے راستہ میں نماز مسافرت کی موافق مذہب حنفیہ کے کیوں نہیں پڑھا یعنی قصر کیوں نہیں کیا؟ مولانا عبدالحی صاحبؒ نے ہم آٹھ نو آدمیوں کے سامنے اس حکایت کو لکھنؤ میں بیان کیا تھا......مولانا عبدالحی صاحب فرماتے تھے کہ یہ سب کشف فقط سنت پر عمل کرنے سے حاصل تھا، المختصر مولانا عبدالحی صاحبؒ نے مولانا نوراللہ مرقدہ کو اس مسئلہ کا یہ جواب دیا کہ میں لکھنؤ سے سندیلہ کی نیت سے چلا تھا، وہاں آ کر عزم ہوا کہ آپ کی زیارت حاصل کریں، یہ دو سفر ہو گئے، تین منزل نہیں ہوئے، آپ نے اس پر ارشاد فرمایا: کہ بھائی! تم بڑے محقق ہو، مگر تحقیق مسئلہ یوں ہی ہے کہ فقہاء نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ جب دو سفر کو جمع کیا جائے اس پر حکم تین منزل کا ہوگا، ان دونوں سفروں کو سفر واحد سمجھا جاوے گا، مولانا عبدالحی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ واقعی میں نے جو کتابوں کو دیکھا تو ترجیح اسی مسئلہ کو تھی'' (۱) (ص: ۹۷ بحوالہ فضل رحمانی ۴۴، ۴۵، ج: ۱)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ ڈانٹ (اگر اسے ڈانٹ کہا جاسکے) قصر پڑھنے پر نہیں بلکہ قصر نہ

پڑھنے پر پڑی، جہاں تک اس مسئلہ کی تحقیق کی بات ہے اسے درج کیا جاتا ہے۔ اگر حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے سفر کی نوعیت یہی تھی کہ پہلے انہوں نے لکھنؤ سے سندیلہ کے سفر کی نیت کی تھی اور سندیلہ سے گنج مرادآباد کے سفر کا قصد فرمایا اور نہ لکھنؤ سے سندیلہ مسافت قصر ہے اور نہ سندیلہ سے گنج مرادآباد تو ان کا یہ عمل کہ انہوں نے سندیلہ سے گنج مرادآباد کے سفر میں قصر نہیں فرمایا بالکل درست ہے، اس پر حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ کا ٹوکنا اور حضرت مولانا عبدالحیؒ کا اس میں اپنی غلطی کا تسلیم کرنا سمجھ میں نہیں آتا، کتب فقہ اور فقہاء کی تصریحات اس کے برخلاف ہیں۔

آدمی شرعی مسافر اسی وقت ہوتا ہے جب وہ تین دن کی مسافت (۴۸ رمیل) طے کرنے کی نیت سے سفر شروع کرتا ہے، اگر کسی شخص نے دو روز کی مسافت طے کرنے کی نیت سے سفر کا آغاز کیا، پھر وہاں پہنچ کر مزید دو روز کی مسافت طے کرنے کی نیت سے آگے سفر کیا، اسی طرح وہ کرتا رہا تو وہ مسافر شرعی نہ ہوگا اور اس کے لئے قصر کرنے کی گنجائش نہ ہوگی، ہاں اگر وہ کسی بھی مرحلہ میں بیک وقت تین روز کی مسافت طے کرنے کی نیت سے سفر شروع کر دے گا تو مسافر شرعی ہو جائے گا اور قصر کرنا ہوگا، اسی طرح واپسی کے سفر میں اگر اس کے آخری مقام اور وطن (جہاں واپس آرہا ہے) کے درمیان تین دن یا اس سے زیادہ کی مسافت ہے تو وہ قصر کرے گا۔

اس سلسلے میں ہم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجموعۂ فتاوی امداد الفتاویٰ سے ایک استفتاء اور اس کا جواب نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، اسی طرح اس جواب میں **الدر المختار** اور **رد المحتار** کی جس عبارت کو استدلال میں پیش کیا گیا ہے اس کا ترجمہ بھی درج کر دیتے ہیں تاکہ قارئین کے لئے مسئلہ زیادہ واضح ہو جائے، استفتاء اور جواب کا عنوان ہے ''عدم قصر در قطع مسافت سفر بصورت عدم عزم مسافت قصر'' یعنی قصر کی مسافت کا عزم نہ ہونے کی صورت میں مسافت سفر طے کے باوجود قصر نہ کرنا، سوال (۵۲۴) زید وطن سے مظفر نگر کا عازم ہو کر چلا اور قصد ہے کہ دو یوم میں واپس ہو جائے گا، وہاں پہنچ کر ضرورت محسوس ہوئی کہ سہارنپور ہو آئے وہ سہارنپور سے واپس میرٹھ واپس ہولیا، میرٹھ سے مظفر نگر سفر شرعی نہیں اور نہ مظفر نگر سے سہارنپور، ہاں میرٹھ سے سہارنپور سفر ہے، پس سفر کے دو ٹکڑے علحدہ و مستقل نیت سے مظفر نگر سے روانگی کے وقت سفر بنیں گے یا نہیں یعنی سہارنپور سے میرٹھ آتے وقت تو سفر کا حکم ہو ہی گا، مظفر نگر سے سہارنپور تک بھی حکم سفر ہوگا یا نہیں؟

الجواب! في الدر المختار ومن طاف الدنيا بلا قصد لم يقصر، في رد المحتار قوله بلا قصد بأن قصد بلدة بينه وبينها يومان للإقامة بها فلمّا بلغها بداله أن يذهب إلى بلدة بينه وبينها يومان وهلم جرّا قال في البحر وعلى هذا قالوا أمير خرج مع جيشه فيطلب العدو ولم يعلم أين يدركهم فإنه يتم وإن طالت المدة أو المكث، أما في الرجوع فإن كانت مدة سفر قصر"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہ شخص مظفر نگر سے سہارنپور جاتا ہوا قصر نہ کرے گا اور سہارنپور سے میرٹھ آتے ہوئے قصر کرے گا فقط ۱۸ر صفر ۱۳۲۵ھ (امداد الفتاویٰ جلد اول ص: ۵۹۶)

درمختار اور شامی کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔

''درمختار میں ہے اور جس نے (مسافت قصر کے) ارادے کے بغیر پوری دنیا کا چکر لگا یا وہ قصر نہیں کرے گا، ردالمحتار میں الدرالمختار کے قول بلا قصد کے تحت ہے: اس طور پر کہ کسی ایسے شہر کا قصد کیا جس کے اور اس شخص کے درمیان دو دن کی مسافت ہے وہاں قیام کرنے کے لئے، جب وہاں پہنچا تو اس کا ارادہ بنا کہ وہاں سے ایسے شہر جائے جس کے اور اِس شہر کے درمیان دو روز کی مسافت ہے اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہا، البحر الرائق میں ہے: اسی بنیاد پر فقہاء نے کہا ہے کہ ایک امیر اپنے لشکر کے ساتھ دشمن کے تعاقب میں نکلا اور اسے نہیں معلوم کہ وہ دشمن کو کہاں پالے گا تو وہ اتمام کرے گا (پوری نماز پڑھے گا) اگرچہ مدت یا ٹھہرنا طویل ہو جائے، ہاں واپسی میں اگر سفر کی مدت ہو تو قصر کرے گا)

حضرت تھانویؒ کے فتویٰ اور درمختار نیز شامی اور البحر الرائق کی عبارتوں سے مسئلہ بالکل واضح ہو گیا، حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحب لکھنؤ سے سندیلہ تشریف لے گئے اور وہاں سے گنج مرادآباد کے سفر کا پروگرام بنا تو سندیلہ سے گنج مرادآباد کے سفر میں سفر کی مدت والی مسافت نہ ہونے کی بنا پر قصر کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے اس لئے مولانا تجمل حسین بہاری کی فضل رحمانی میں بیان کردہ روایت میرے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، اس میں بیان واقعہ میں کوئی غلطی ہوگئی ہے۔

یہی واقعہ حضرت مولانا علی میاںؒ کی کتاب ''تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمان'' میں مفتی عبداللطیف رحمانی کے مضمون میں دوسرے انداز سے لکھا ہوا ہے جو قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، ہم اسے بھی نقل کرتے ہیں۔

(۲) ''مولوی عبدالحی صاحب فرنگی محلی ایک بار خدمت میں حاضر ہوئے، لکھنؤ سے گنج مرادآباد تک جو سیدھا راستہ ہے وہ اتنا نہیں ہے جس میں نماز کا قصر کیا جائے لیکن مولوی عبدالحی صاحب ایک ایسے راستے سے آئے جس میں قصر کیا جاسکتا تھا، مگر انہوں نے سمجھا کہ جب اصلی راستہ میں قصر نہیں ہے تو اس راستہ میں بھی قصر نہ کرنا چاہئے، مولانا نے فرمایا کہ قصر کرو، مولوی عبدالحی صاحب فرماتے تھے کہ جب میں نے کتابوں کی طرف مراجعت کی تو وہی بات صحیح پائی جو مولانا نے فرمائی تھی'' (تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی ص:۱۳۸) [۱]

مذکورہ بالا اقتباس میں درج حاشیہ بخاری میں غلطی کی نشاندہی کی تفصیل بھی حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا تصنیف کے حوالہ سے پڑھیے، یہ واقعہ بھی موصوف نے حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا تجمل حسین کی کتاب فضل رحمانی سے نقل کیا ہے۔

جناب مولانا احمد علی صاحبؒ بخاری شریف چھاپ کر بہت عمدہ خوش خط ایک جلد آپ کے لئے تحفہ لائے، چونکہ آپ کی عادت شریف تھی کہ جو کتاب مطبع سے لوگ نذر لاتے تھے، اس کے آپ چند ورق اِدھر اُدھر کے الٹ کر غلطی بتادیتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے پہلے دیکھ رکھا ہو، غرض اس بخاری شریف میں کئی جگہ ورق بے انداز الٹ دیے اور فرمایا کہ یہ غلطی ہے اور وہ غلطی ہے، استاذی حضرت مولانا احمد علی صاحب بہت متعجب ہوئے کہ آٹھ برس سے اس کتابت کو درست کررہا ہوں، غلطیاں نظر نہیں آتی تھیں، آخر

---

[۱] جہاں تک یہ راقم سمجھ سکا ہے فاضل مضمون نگار یہ بتانا چاہتے ہے کہ دراصل مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے اپنے سفر میں نماز قصر نہیں کی تھی، اور حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ نے ان سے فرمایا تھا کہ انہیں قصر پڑھنی چاہئے تھی۔۔۔۔ جب کہ حضرت مولانا نقشبندی دامت برکاتہم کے بیان میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے قصر پڑھی تھی، جس پر حضرت گنج مرادآبادی نے ان کو تنبیہ فرمائی تھی۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار مولانا عتیق صاحب نے اسی واقعہ کے دوراویوں مولانا تجمل حسین بہاری اور مفتی عبداللطیف رحمانی صاحب کی روایت میں بھی ایک اختلاف نقل کردیا ہے۔ یعنی یہ کہ اول الذکر کی روایت سے مولانا عبدالحی کے قصر نہ کرنے کی وجہ کچھ اور معلوم ہوتی ہے اور مؤخر الذکر کی روایت سے کچھ اور۔۔ اور اس طرح ضمناً یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ کسی واقعہ کے نقل کرنے میں ان لوگوں سے بھی غلطی ہوسکتی ہے جو براہ راست ان واقعات کا سوانحی تذکرہ پیش کرنے کے ہی مقصد سے قلم اٹھاتے ہیں۔ یاد رہے کہ مولانا تجمل حسین بہاری حضرت گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے، جن کی روایت کو ہمارے فاضل مضمون نگار نے ناقابلِ قبول بتلایا ہے۔۔ پس علمی دنیا میں اس طرح کے تسامحات کچھ اجنبی شئے نہیں ہیں۔

پھر غور کر کے کئی ورق کا غلط نامہ بخاری شریف میں چھاپ کر لگایا گیا''

(ص:۸۰ بحوالہ فضل رحمانی ۴۷،۴۸، ج:۱)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کو تصحیح کتب میں بڑی مہارت حاصل تھی، انہوں نے ایک مدت تک مختلف مطابع میں تصحیح کا کام انجام دیا تھا، حضرت مولانا عبدالحی حسنیؒ نے نزھۃ الخواطر میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے۲؎ (نزھۃ الخواطر جلد:۸ ص:۳۵۸)

حضرت گنج مرادآبادی اور حضرت گنگوہی:

حضرت گنگوہی اور حضرت گنج مرادآبادی ہی کے واقعہ میں حضرت مولانا نقشبندی فرماتے ہیں:

''اب ذرا سنئے کہ یہ حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی حضرت گنگوہی کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو بڑے بڑوں کو ڈانٹ دیتے تھے، ایک مرتبہ مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کا خادم حضرت گنگوہی کو ملنے کے لئے آگیا، جب واپس جانے لگا تو حضرت گنگوہی نے کہا کہ اپنے پیر سے کہنا کہ خلق محمدی اختیار کریں، Reason (وجہ) یہ تھی کہ حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کے پاس اکثر جو لوگ جاتے تھے ڈانٹ کھا کے آتے تھے، ہر آنے والے کو ڈانٹ پڑتی تھی، اس پر حضرت گنگوہیؒ نے ان کے خادم کو یہ پیغام دے دیا'' (ص:۶۵)

قصہ کا ابتدائی حصہ اوپر نقل کیا گیا، ہمارے نزدیک یہ پورا قصہ محل نظر ہے، اس کا اصل حوالہ اور مآخذ معلوم ہونے کے بعد ہی اس پر تفصیلی گفتگو کی جاسکتی ہے، لیکن ایک صاحب علم وذوق قاری کا ذہن بادی النظر میں بھی اس کو قبول نہیں کرتا کہ حضرت گنگوہی حضرت گنج مرادآبادی کو اس طرح کا پیغام ان کے خادم کے ذریعہ بھیجیں، حضرت گنج مرادآبادی حضرت گنگوہی کے اساتذہ اور بزرگوں کی صف کے ہیں، حاجی امداد

۲؎ صحیح بخاری کے حاشیہ میں کچھ غلطیوں کی نشان دہی جو حضرت گنج مرادآبادی نے کی تھی، ان کے بارے میں ہمارے حضرت نقشبندی کا اشارہ اِس طرف ہے کہ وہ نظرِ کشفی کا ثمرہ تھا، اور یہی بات حضرت گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا تجمل حسین بہاری کے طرزِ بیان سے بھی سمجھی جاسکتی ہے۔ البتہ فاضل مضمون نگار کا اشارہ اِس طرف ہے کہ دراصل یہ نتیجہ تھا اُس مہارت کا جو حضرت گنج مرادآبادی کو تصحیحِ کتب کے تجربے کی بدولت حاصل تھی۔۔۔ ہمارا خیال ہے کہ اسے تجزیہ کے دو قدرے مختلف انداز تو کہا جاسکتا ہے ''تسامح'' نہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ یہ دونوں ہی ''سبب'' جمع ہوں؟

اللہ مہاجر مکی جو حضرت گنگوہیؒ کے پیر مرشد ہیں وہ بھی حضرت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی سے عمر میں تقریباً ۲۵/سال چھوٹے ہیں، حاجی صاحب کی پیدائش ۱۲۳۳ھ میں ہوئی جب کہ حضرت گنج مراد آبادی کی ۱۲۰۸ھ میں پیدائش ہوئی، حضرت گنج مراد آبادی حضرت گنگوہی سے عمر میں تقریباً ۳۸/سال بڑے تھے، حضرت گنگوہی کی پیدائش ۱۲۴۴ھ کی ہے، حضرت گنج مراد آبادی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور حضرت شاہ محمد اسحاقؒ صاحب کے شاگرد تھے اور حضرت گنگوہی حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے شاگرد ، سن وسال میں اس غیر معمولی تفاوت کے باوجود یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت گنگوہی جیسا متواضع اور مؤدب شخص اپنے بڑوں کے بڑے کو اس طرح کا پیغام بھیجے، اس طرح کی روایات سے ہمارے اکابر کی شان بڑھتی نہیں بلکہ گھٹتی ہے۔

تذکرۃ الرشید جو حضرت گنگوہیؒ کی سب سے مستند سوانح ہے اس میں ان دونوں بزرگوں کے بارے میں ایک واقعہ درج ہے، جس سے دونوں کے ایک دوسرے کے بارے میں آخری درجہ کے اکرام واحترام کا پتہ چلتا ہے، اسے ہم نقل کرتے ہیں:

''مولوی عبدالحمید صاحب ہزاروی فرماتے تھے کہ جب میں نے مولوی ...... کے پاس حدیث شریف پڑھنی شروع کی تو دل اندر سے گھبراتا تھا اور خواب میں اکثر خنزیز کے بچے نظر آیا کرتے تھے کہ میرے چاروں طرف پھرتے ہیں، ایسی خوابیں دیکھ کر میرا دل بالکل اچاٹ ہوگیا اور میں وہاں سے روانہ ہوکر سیدھا گنج مراد آباد حضرت مولانا فضل الرحمن صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا، وہاں حاضر ہوکر میں نے اپنے پڑھنے اور خوابوں کی حالت بیان کی، مولانا نے دریافت فرمایا: پڑھتے کہاں ہو؟ میں نے عرض کیا دہلی میں مولانا ...... کے پاس، آپ نے ارشاد فرمایا کہ گنگوہ میں مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں جاکر پڑھو، وہاں حدیث کی دوکان کھلی ہوئی ہے، اس کے بعد دیر تک حضرت امام ربانی قدس سرہ (مولانا گنگوہی) کی تعریف کرتے رہے اور فرمایا کہ تم جاؤ تو ہمارا سلام کہنا اور بتادینا کہ مجھے آپ کی خدمت میں فضل الرحمن نے بھیجا ہے، غرض مولوی عبدالحمید گنگوہ آئے، جس وقت حضرت کی خدمت میں پہنچے تو حضرت وضو کے لئے چوکی پر بیٹھے اور مسواک کررہے تھے، ان کو دیکھ کر مسکرائے، انہوں نے سلام کیا اور حضرت مولانا فضل الرحمن کا سلام اور پیام پہنچایا اور یہ بھی عرض کیا کہ مولانا نے آپ کی بہت تعریف کی اور انہیں کا بھیجا ہوا حاضر خدمت ہوا ہوں، حضرت امام ربانی نے ان کی تقریر سن کر بکمال تواضع ارشاد فرمایا:

چونکہ وہ خود قابل تعریف ہیں اس لئے دوسروں کی بھی تعریف فرماتے ہیں ورنہ ''من آنم کہ من دانم'' مولوی عبدالحمید صاحب فرماتے تھے کہ آخر میں نے حدیث شروع کی اور حضرت کے فیض سے مستفیض ہوا، اسی دن سے روز بروز پریشانی کم ہوتی اور فرحت بڑھتی رہی'' (تذکرہ الرشید جلد ۲، ص، ۳۲۱،۳۲)

مولانا عاشق الہیؒ میرٹھی تذکرۃ الرشید میں ایک دوسرا واقعہ لکھتے ہیں: ''مولوی محمد سہول صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت کے وصال کے بعد مجھے سید طاہر صاحب رئیس مولانگر ضلع مونگیر سے ملنے کا اتفاق ہوا، حضرت امام ربانی قدس سرہ کا کچھ تذکرہ آ گیا، سید صاحب چشم نم ہوئے اور قسم کھا کر فرمایا: کہ ایک دن میں اپنے مرشد حضرت مولانا فضل الرحمن صاحبؒ کی خدمت میں حاضر تھا، بزرگوں کا تذکرہ ہو رہا تھا کہ ایک شخص نے حضرت مولانا رشید احمد قدس سرہ کی حالت دریافت کی، مجھے خوب یاد ہے حضرت مولانا نے یہ لفظ فرمائے کہ'' مولانا رشید احمد کا کیا حال پوچھتے ہو وہ تو دریا پی گئے اور ڈکار تک نہیں لیا'' حضرت کی زبان مبارک سے جس وقت میں نے یہ ارشاد سنا اسی وقت سے حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے واقف ہوں اور بڑا بزرگ سمجھتا ہوں'' (تذکرۃ الرشید جلد ۲، ص:۳۲۱)

چند مزید تسامحات:

حضرت مولانا ذوالفقار نقشبندی دامت برکاتہم کے زیر بحث خطاب میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ کے بارے میں بھی چند ایسی چیزیں مذکور ہیں جو محل نظر یا کم از کم قابل تحقیق ہیں، ان کا بھی یہاں تذکرہ کر دینا مناسب ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''جب شیخ الہند کی وفات ہوئی تو حضرت مدنیؒ کلکتہ گئے ہوئے تھے، وہاں سے ان کو خبر ملی اور وہ اپنے شیخ کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے واپس تشریف لائے، جب جنازہ ادا ہو گیا تو جو غسل دینے والا تھا اس نے پوچھا کہ میں نے حضرت شیخ الہند کی کمر کے اوپر نشان دیکھے ہیں، وہ نشان عام نہیں ہوتے، پتہ نہیں یہ کیسے نشان تھے، ذرا پتہ کریں، گھر والوں سے پتہ کیا تو گھر والوں کو بھی پتہ نہیں تھا، کیونکہ حضرت کی عادت تھی کہ گھر میں بھی ہمیشہ بنیان میں رہتے تھے، کسی نے حضرت مدنی سے پوچھا کہ حضرت! آپ کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الہند کی پشت پہ یہ نشان کیسے تھے؟ تو

حضرت مدنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرمانے لگے کہ میرے شیخ کا راز تھا اور انہوں نے مجھے فرمایا ہوا تھا کہ میری زندگی میں تم کسی کو نہ بتانا اور میں نے آج تک نہیں بتایا، اب چونکہ وفات پا چکے ہیں اس لئے اب میں بتاتا ہوں کہ جب ہم مالٹا میں قید تھے، اس وقت فرنگی نے ایک مرتبہ شیخ الہند کو بلایا اور فرمایا کہ تم یہ کہو کہ تم ہمارے ساتھ ہو، حضرت نے فرمایا: میں نہیں کہہ سکتا، تو اس نے انگارے گرم کروائے، آگ جلوائی اور کہا کہ تمہیں ان انگاروں پر لٹادوں گا، حضرت نے فرمایا میں نہیں کہہ سکتا، انگاروں پر لٹایا گیا، پیچھے زخم ہوئے، بدن جلا، یہ ان زخموں کے نشانات ہیں اور جب یہ سزا دینے کے بعد حضرت کمرے میں آئے تو رات میں سویا نہیں جارہا تھا، بیٹھے تھے، ہم شاگرد تھے، ہم سے حضرت کی یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی تھی، ہم نے اس وقت عرض کیا کہ حضرت! آخر امام محمدؒ نے کتاب الحیل لکھی، حیلہ تو شریعت میں جائز ہے، اپنی جان بچانے کے لئے انسان کچھ نہ کچھ کرسکتا ہے، آپ کوئی ذو معنی لفظ بول دیں کہ جس سے جان بھی چھوٹ جائے اور یہ ظالم بھی ہٹ جائیں، جان بچانے کے لئے تو اجازت ہوگی، فرمانے لگے جب میں نے یہ الفاظ کہے تو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا، مدنی! کیا سمجھتے ہو، میں روحانی بیٹا ہوں حضرت بلال کا، میں روحانی بیٹا ہوں حضرت خبیب کا، میں روحانی بیٹا ہوں امام مالک کا، میں روحانی فرزند ہوں امام اعظم کا، میں روحانی بیٹا ہوں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا، حسین احمد! یہ میرے جسم سے جان نکال سکتے ہیں، یہ میرے دل سے ایمان نہیں نکال سکتے، کیسی اللہ نے ان کو استقامت عطا فرمائی تھی۔

(الفرقان: مئی، جون ۲۰۱۱ء ص: ۶۷، ۶۸)

اس پورے واقعہ کے لئے حوالہ کی ضرورت ہے، حضرت شیخ الہند اور حضرت شیخ الاسلام کے بارے میں جو معروف کتابیں دستیاب ہیں ان سب کی طرف مراجعت کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اس مؤثر واقعہ کا کہیں سراغ نہیں ملا، اسارت مالٹا پر مختصر اور مفصل بہت سی کتابیں نظر سے گذری ہیں لیکن ایسا کوئی واقعہ نظر سے نہیں گذرا، حضرت مولانا نقشبندی، ان کے کوئی مسترشد یا کوئی اور اہل علم اس واقعہ کے مآخذ کی نشاندہی

کردیں تو ہم جیسے طالب علموں پر بڑا احسان ہوگا۔

اس طرح ''حضرت شیخ الہند پر خدا کی شان بے نیازی کا اثر'' کے زیر عنوان جو واقعہ درج ہے (ص:۶۸، ۶۹) وہ بھی بڑا موٴثر ہے لیکن اس کے لئے بھی حوالہ کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا نقشبندی صاحب حضرت تھانوی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''حضرت تھانوی! سبحان اللہ! ۲۰۰۰ سے زیادہ کتابیں لکھیں'' (ص:۶۶)

حضرت تھانویؒ ہمارے بزرگوں میں سب سے زیادہ کثیر التصانیف ہیں بلکہ تاریخ اسلام کے چند ممتاز ترین کثیر التصانیف مصنفین کی مختصر سے مختصر فہرست بنائی جائے تو اس میں حضرت تھانویؒ کا نام ضرور شامل ہوگا، پھر حضرت تھانویؒ کا امتیاز تصانیف کی تعداد اور کمیت ہی کے بارے میں نہیں بلکہ کیفیت کے بارے میں بھی ہے، ہر تصنیف شاہکار اور بیش بہا علوم ومعارف کا ذخیرہ ہے۔

لیکن حضرت تھانویؒ کی کتابوں کی تعداد دو ہزار بیان کرنا خلافِ واقعہ ہے، اشرف السوانح (جو حضرت تھانوی کی سب سے مستند سوانح ہے) میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب نے حضرت کی تصنیفات اور مواعظ کی تعداد ۶۶۶ لکھی ہے اور ان کی پوری فہرست درج فرمائی ہے (ملاحظہ ہو: اشرف السوانح حصہ سوم ص: ۳۴۵ تا ۳۵۹) وہ فہرست حضرت کے حیات کی ہے، اس کے بعد بھی کچھ اضافہ ہوا ہوگا لیکن تمام سوانح نگاروں کے مطابق تصنیفات، مجموعۂ مواعظ، مجموعہ ملفوظات اور مجموعہ مکتوبات سب کی تعداد ملا کر ایک ہزار کے اندر ہے، لہذا دو ہزار کتابوں کو حضرت تھانویؒ کی طرف منسوب کرنا تسامح ہے جس کا ازالہ کیا جانا چاہئے۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں حضرت مولانا نقشبندی نے فرمایا ہے:

''پھر آگے دیکھئے، حضرت مدنی کو کہ ۱۸ر سال مسجد نبوی میں گنبد خضراء کے قریب بیٹھ کر انہوں نے حدیث پاک کا درس دیا، محدث حدیث پڑھاتے ہیں تو قال قال صلی اللہ علیہ وسلم پڑھاتے ہیں اور حضرت مدنی پڑھاتے تھے تو اشارہ کر کے کہتے تھے ''قال هذا النبي صلی الله علیه و سلم'' مسجد نبوی میں ۱۸ر سال درس دینا کوئی معمولی بات تو نہیں ہے'' (ص:۶۶)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ ارشاد کہ آپ نے ۱۸ر سال تک مسجد نبوی میں حدیث پاک کا

درس دیا، تسامح سے خالی نہیں، شیخ الاسلام مولانا مدنی پر سب سے زیادہ مفصل کتاب مولانا فرید الوحیدی صاحب کی ''شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی'' کے نام سے ہے، اس کتاب میں حضرت مدنی کے قیام مدینہ منورہ کا تفصیلی تذکرہ ہے، کل ملا کر تقریباً پندرہ سال قیام رہا، یہ قیام چار قسطوں میں رہا، پہلا قیام جو دو سال رہا (۱۳۱۷ھ ۱۳۱۸ھ) اس میں حضرت مدنی نے کتب حدیث کا درس نہیں دیا بلکہ ابتدائی کتابوں کا درس دیا، اور بعد کے تین قیاموں میں جس کی مجموعی مدت تیرہ سال بنتی ہے دوسرے مضامین کے ساتھ حدیث کا بھی درس دیا۔ (ملاحظہ ہو: شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، ص: ۱۲۴ تا ۱۷۱)

اسی طرح کی اور بھی چند فروگذاشتیں اس خطاب میں ہیں جن کی درستگی ہونی چاہئے، ماہنامہ الفرقان بزرگان دین خصوصاً اکابر دیوبند کے حالات وکمالات میں مستند ترین مجلہ مانا جاتا ہے اور علمی ودینی حلقوں میں اس پر بڑا اعتماد کیا جاتا ہے لہذا اس طرح کے تسامحات اور فروگذاشتوں کا ازالہ اور تصحیح نہایت ضروری ہے۔

☆☆☆

الفرقان کی ڈاک

(۱)

مکتوب گرامی حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

باسمہ تعالیٰ
اللہ۔ اللہ۔ اللہ

1/5

من فقیر
حال نزیل
مکہ مکرمہ

عزیز القدر عزیز المقام حضرت مولانا سجاد نعمانی صاحب زید مجدہٗ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا مکتوب شرف صدور لاکر کاشف احوال ہوا۔ مکتوبہ حالات سے آگاہی ہوئی۔ آپ نے فقیر کے بیان "بارگاہِ خداوندی میں قابلیت سے زیادہ قبولیت کا اعتبار" پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک محقق عالم دین حضرت مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی دامت برکاتہم کا علمی تحقیقات پر مبنی مضمون بھیجا ہے۔ مضمون پڑھ کر دلی طمانیت نصیب ہوئی کہ الحمدللہ ایسی ہستیاں آج بھی موجود ہیں کہ جنہیں ہماری اصلاح کی فکر دامنگیر ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ایسے حضرات کا سایہ نعمت عظمیٰ ہوا کرتا ہے جو انی لکم ناصح امین کی عملی تصویر ہوتے ہیں۔

انسان ضعیف البنیان ہے اور نسیان اس کی فطرت میں شامل ہے۔ فقیر جیسے ایک ادنیٰ طالبعلم سے علمی تسامح کا وقوع پذیر ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تاہم خوشی اس بات کی ہے کہ غلطی کی نشاندہی کرنے والے محسنین سے ہم ابھی محروم نہیں ہوئے۔ اس پر رب کائنات کا جتنا شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے۔ فقیر کی زبان پر بے اختیار رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی کے الفاظ جاری ہیں۔ الحمدللہ۔

آپ جانتے ہیں کہ فقیر اس وقت فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مکہ مکرمہ میں اہل خانہ کے ہمراہ قیام پذیر ہے۔ یہاں پر حرم شریف کے انوار وبرکات زائرین بیت اللہ کی طبائع پر عشق الٰہی کی ایسی مستی طاری کر دیتے ہیں کہ ہر وقت تکبیر اولیٰ کا اہتمام۔ تلاوت قرآن مجید کی کثرت۔ طواف کعبۂ ربانی کی لذت اور مناجات کی حلاوت زائرین کو عدیم الفرصت بنا دیتی ہے۔ قلب کو اس جذب وانجذاب اور سوز ومستی کی کیفیت سے نکلنے پر آمادہ کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ تاہم مکتوب گرامی کی اہمیت کے پیش نظر فقیر چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے تاثرات بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

آمدم بر سر مطلب ۔ فقیر کی نظر میں مولانا موصوف دامت برکاتہم کے مضمون کا لب لباب درج ذیل خاکہ کی شکل میں پیش خدمت ہے ۔

2/5

عنوان	فقیر کے بیان کی غلطی	مولانا موصوف مدظلہٗ کی تحقیق	نتیجہ
① حضرت نانوتویؒ کا سن وفات	اسی سال حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا انتقال ہو گیا	دوسرے مباحثہ اور حضرت نانوتوی کی وفات کے درمیان تقریباً تین سال کا فاصلہ ہے	سن وفات نقل کرنے میں تسامح ہوا
② حضرت نانوتویؒ کی تحشیۂ بخاری میں شرکت ۔	باقی پانچ پارے ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس کو مکمل کیا	پانچ پارے کا یہ تحشیہ ان کے ابتدائی عمر کا کارنامہ ہے	پانچ پارے وفات کے بعد کی بجائے ان کی زندگی میں مکمل ہوئے
③ مولانا فضل الرحمٰنؒ گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی	سفر میں قصر نماز پڑھی	سفر میں قصر نماز نہ پڑھی	واقعہ درست مگر پڑھنے اور نہ پڑھنے میں تسامح ہوا
④ مولانا فضل الرحمٰنؒ گنج مرادآبادی اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری	فرمایا تمہارے حاشیہ میں فلاں جگہ غلطی ہے کشفاً پتہ چل گیا	آپ چند ورق ادھر اُدھر کے الٹ کر غلطی بتا دیتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے پہلے دیکھ رکھا ہو	الفاظ مختلف مگر مفہوم کلام ایک ہے
⑤ حضرت گنج مرادآبادیؒ اور حضرت گنگوہیؒ	حضرت گنگوہی نے کہا کہ اپنے پیر سے کہنا کہ خلق محمدی اختیار کریں ۔	ہمارے نزدیک یہ پورا قصہ محل نظر ہے	یہ واقعہ فقیر نے انڈیا کے بیرون ملک سفر کرنے والے ایک استاذ حدیث یا مفتی صاحب کے خطبات میں پڑھا ۔ سفر حج کے بعد کتاب تلاش کر کے نام اور عنوان بتایا جا سکتا ہے

3/5

عنوان	فقیر کے بیان کی عبارت	مولانا موصوف مدظلہ کی تحقیق	نتیجہ
(6) حضرت تھانویؒ کی تصنیفات	حضرت تھانویؒ نے سبحان اللہ 2000 سے زائد کتابیں لکھیں	کتابوں کی تعداد ایک ہزار کے اندر ہے	حضرت مولانا عبد القادر آزاد خطیب بادشاہی مسجد نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حضرت تھانویؒ کے عنوان پر پی ایچ ڈی کی۔ فقیر نے یہ بات ان سے سنی اور نقل کردی
(7) حضرت مدنیؒ کا مسجد نبوی میں درس حدیث دینا	حضرت مدنیؒ کا مسجد نبوی میں 18 سال درس حدیث دینا کوئی معمولی بات نہیں	تین قیاموں میں جس کی مجموعی مدت 13 سال بنتی ہے دوسرے مضامین کے ساتھ حدیث کا درس بھی دیا۔	درس حدیث دینے والی روایت صحیح مگر مدت 18 سال کی بجائے 13 سال ہے۔
(8) حضرت شیخ الہند پر خدا کی شان بے نیازی کا اثر	-	حضرت مولانا عبد الواحدؒ حضرت مدنی کے شاگرد تھے۔ دار العلوم دیوبند سے دورۂ حدیث مکمل کیا تھا۔ 30 سال مسلم شریف پڑھانے کی سعادت پائی۔ فقیر کے ساتھ سلوک واحسان کے معاملہ میں اصلاحی تعلق رکھتے تھے۔ ایک مجلس میں انہوں نے حضرت خود غشتوی سے سنے ہوئے واقعات نقل کئے۔ جن کو فقیر نے اپنے بیان میں نقل کردیا۔	

فقیر کے تاثرات :- فقیر کے بیان "بارگاہ خداوندی میں قابلیت سے زیادہ قبولیت کا اعتبار" کے مضمون کا اصل حصہ قرآنی آیات احادیث مبارکہ اور اقوال مشائخ پر مبنی ہے۔ پورے مضمون کے آخر میں اکابرین علمائے دیوبند کی قبولیت کے چند واقعات بیان کئے گئے تھے۔ مولانا موصوف مدظلہ نے اصل مضمون کو پسند فرمایا اور لکھا " خطاب بہت ہی مؤثر اور مفید باتوں پر مشتمل ہے اور مجموعی طور پر پرتاثیر ہے"۔

البتہ تاریخی واقعات میں چند تسامحات کی نشاندہی فرمائی ہے جسے ہمیں

(415)

کھلے دل سے قبول کرنا چاہیے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں "دید قصور" کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک کو ہر وقت اپنے عیبوں، کوتاہیوں اور غلطیوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ پتہ چل جانے پر فوراً اصلاح کر لینی چاہیے۔

فقیر کے نزدیک اپنی غلطی کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام لینا یا لیت ولعل کرنا اپنی اصلاح کا راستہ بند کرنے کے مترادف ہے۔ غلطیوں کا پتہ چل جانا تو فقرا کی عید ہوتی ہے۔ ہمارے مشائخ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے اپنے عیبوں سے مطلع فرما دیتے ہیں اور جب کسی بندے سے ناراض ہوتے ہیں تو اس کی نظر سے اس کے عیوب پوشیدہ فرما دیتے ہیں۔ سلف صالحین نے ہمیشہ اپنی غلطیوں کو بے چون وچرا تسلیم کیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ منبر پر کھڑے ہو کر اعلان فرمایا۔ کہ مالدار لوگ اپنی بیویوں کے حق مہر کی رقم بہت زیادہ متعین کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے غریب لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے لہٰذا مالدار لوگ ایک مناسب مقدار متعین کیا کریں۔ حضرت عمرؓ جب منبر سے نیچے اترے تو ایک حبشی عورت نے راستہ روک کر کہا۔ امیر المومنین۔ آپ کو قرآن مجید کی آیات میں تصرف کرنے کا اختیار کیسے مل گیا؟۔ پوچھا وہ کیسے؟۔ کہنے لگی کہ جب اللہ تعالیٰ نے عورت کے حق مہر کے متعلق احداھن قنطاراً (سونے چاندی کا ڈھیر) کا لفظ استعمال کیا ہے تو آپ اس کو کم کرنے کا حکم کیسے دے سکتے ہیں۔

حضرت عمرؓ واپس منبر پر آئے اور فرمایا کہ ایک عورت نے میری غلطی کی نشاندہی کر دی لہٰذا میں اپنی بات سے رجوع کرتا ہوں۔

نوٹ۔ [(فقیر نے کتب کی عدم موجودگی کی وجہ سے قصے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے]

5/5

حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے۔ رحم اللہ عبدا اھدٰی الی عیوبی

مفہوم کلام : ← جو شخص میرے پاس میرے عیوب کا تحفہ لائے گا میں اس کیلئے
مغفرت کی دعا کرونگا۔

ہمارے سلف صالحین نے اس بارے میں ایک منہج متعین فرما دیا ہے پس جو
شخص ان کے راستے پر چلے گا وہ قیامت کے دن ان کی معیت پائے گا۔
اگر راستہ بدل جائے گا تو منزل بھی بدل جائے گی۔ اللھم احفظنا منہ۔

لوگ آئینے کو اسی لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ چہرے پر لگے ہوئے داغ
نمایاں کرکے دکھا دیتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے۔
المومن مرآۃ المومن (مومن مومن کا آئینہ ہے)

پس اگر حضرت مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی دامت برکاتہم نے تاریخی واقعات
میں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے تو فقیر کے محسنین میں اپنا نام شامل کروایا ہے۔
آپ مولانا موصوف مدظلہ کو فقیر کی طرف سے یہ پیغام پہنچا دیں۔

" فقیر آپ کا احسانمند ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے آپ سے
محبت کرتا ہے۔ گو کہ فقیر کے پاس دینے کیلئے صرف دعائیں ہیں۔
مگر رب ذوالجلال کے پاس دینے کیلئے تو خزانے ہیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کی امیدوں سے بڑھ کر آپ کو اجر و بدلہ
عطا فرمائے۔ آمین۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ "

دعاگو و دعاجو

فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی
کان اللہ لہ عوضا عن کل شئ
19 ذی الحجہ 1432 ہجری
مکہ مکرمہ۔

(۲)

مکتوب گرامی مولانا عتیق الرحمن سنبھلی مدظلہ العالی

عزیزی سجاد میاں! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں بھی اب کچھ پڑھنے لگا ہوں۔[۱] نومبر کا الفرقان آیا تو اس میں تمہارے اداریے کے بعد وہ مضمون پڑھنے کی طرف طبیعت راغب ہوئی جس کا عنوان ہے ''کیا ہم مرنے کے لئے تیار ہیں''۔ مجھے تو اپنے حال میں ایسا لگا جیسے یہ مضمون مجھے ہی خطاب کر رہا ہے اور بڑی دلچسپی سے پڑھا، بہت نفع ہوا الحمد للہ، بہت ہی مفید مضمون ہے۔ اللہ حضرت پیر صاحب کو اسکی بہترین جزا دے، مگر مضمون کے بالکل اختتام پر ایک ایسی تفسیری روایت آ گئی ہے جو سورۂ یونس کی آیت نمبر ۹۰ کے صریح خلاف ہے، لگتا ہے تم نے پڑھا نہیں تھا ورنہ تم ضرور حضرت والا کو توجہ دلاتے۔ یہ روایت[۲] حضرت جبریلؑ کے حوالے سے بیان کرتی ہے کہ فرعون غرق ہونے لگا تو میں اس کے منھ میں اس ڈر سے کیچڑ ٹھونستا تھا کہ کہیں یہ معافی نہ مانگ لے اور ایمان لا کر

---

[۱] یہ اشارہ اس جانب ہے کہ گذشتہ کافی عرصہ سے شدید ضعف اور علالت کی وجہ سے وہ حالت ہوگئی تھی جس کی وجہ سے کچھ بھی پڑھنا مشکل ہو گیا تھا، اب اس میں کچھ بہتری ہے۔ محترم قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ بھائی صاحب مدظلہ العالی کے لئے دعاؤں کا اہتمام جاری رکھیں۔

[۲] تفسیر وحدیث کی جو چند کتابیں اس وقت میرے پاس ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ بات تو یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ روایت سند کے لحاظ سے بہت کمزور درجہ کی نہیں ہے۔ اس کے روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام ابن جریر طبری، حافظ ابن کثیر، ابن ابی حاتم، اور خازن وغیرہ ہیں۔ امام ترمذی نے اس روایت کو ''حسن صحیح'' قرار دیا ہے۔ مفسر خازن نے تو اس روایت کی ایک سند کو صحیح بخاری کے معیار والی سند (علی شرط البخاری) قرار دیا ہے۔ اور ایک اور سند کو امام مسلم کی معیار والی (علی شرط مسلم) بتایا ہے اسلئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ روایت بے اصل اور نا قابلِ اعتبار ہے۔ تاہم از روئے درایت اگر کسی کو کوئی اشکال ہوتا ہے، جیسا کہ امام رازی اور علامہ زمخشری کو بھی ہوا ہے، تو ان اشکالات کو دور بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بعض دوسرے مفسرین نے مثلاً علامہ خازن نے امام رازی کے اشکالات کے تفصیلی جوابات دئے ہیں۔ اسی طرح مذکورہ آیتِ قرآنی اور اس روایت کے درمیان تطبیق بھی ممکن ہے۔ واللہ اعلم

بخشش کا مستحق نہ ہو جائے اور قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو ایمان کا کلمہ پڑھنے لگا "آمنت انہ لا الہ الا الذی آمنت بہ بنو اسرائیل و انا من المسلمین"۔

اس موازنہ سے اس روایت کے بارے میں اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن میں تمہیں توجہ دلانے کے لئے بس اسی قدر کافی سمجھتا ہوں۔

والسلام

تمہارا بھائی

عتیق الرحمٰن

☆☆☆

اوریا مقبول جان

میرا اللہ فرق واضح کردیتا ہے

جن لوگوں کو افغانستان میں امریکہ کی حالتِ زار دیکھ کر بھی اس بات کا یقین نہ آرہا ہو کہ قوموں کو فتح اور سرفرازی مادی وسائل یا ٹیکنالوجی کے عروج سے نہیں بلکہ غیرت وحمیت سے حاصل ہوتی ہے تو ایسے لوگوں کو غیرت کا درس نہیں پڑھایا جاسکتا۔ ان لوگوں کی جبینیں بنی ہی مادی طور پر طاقتور کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے ہیں اور جن افراد کو افغانستان میں صرف سو سال کے عرصہ میں تیسری عالمی طاقت یعنی پہلے برطانیہ، پھر روس اور اب امریکہ کی شکست کے بعد بھی اس بات کا یقین نہ آئے کہ اس کائنات کا ایک مالک و مختار اور فرماں روا بھی ہے جس کا اپنے بندوں سے وعدہ بھی ہے کہ تم اس پر بھروسہ تو کر کے دیکھو، تم بھی تھوڑے بھی ہو گے تو وہ تمہیں زیادہ بڑے گروہوں پر غلبہ عطا کرے گا۔ تو پھر یہ لوگ وہ ہیں جن کے بارے میں میرا اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہریں لگادی ہیں۔ تاریخ کا یہ کتنا بڑا مذاق ہے، کہ ایک عالمی طاقت جو خود کو واحد عالمی طاقت سمجھتی ہو، جس کے ہتھیاروں کی تکنیکی خوبی ایسی ہو کہ اس کی گرد کو بھی کوئی نہ پہنچ پاتا ہو، وہ چند ہزار طالبان کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہو جائے کہ اپنی ناکامی اور خفت کا ملبہ ایک ایسے ملک میں ''بسنے والے'' تین یا چار ہزار حقانی نیٹ ورک کے لوگوں پر لگادے۔ یہ ''بسنے والے'' میں نے اس لئے لکھ دیا کہ یہ امریکہ کا کہنا ہے ورنہ جس نے افغانستان دیکھا ہے اس کو علم ہونا چاہئے کہ کابل کے ریڈ بلکہ الٹرا ریڈ زون تک شمالی وزیرستان سے جا کر پہنچنا اور اتنا لمبا راستہ اختیار کر کے راستہ میں موجود بھیڑیوں جیسی چیک پوسٹوں اور سیٹلائٹ کی دوربین کی نظروں میں آنا، کسی عقلمند کا کام نہیں۔ آج سے دس سال قبل جب امریکہ افغانستان میں داخل ہوا تھا تو میرے ملک کے طاقت کے پجاری اور مادی وسائل کو خدا سمجھنے والے دانش ور، ادیب، سیاست داں حتیٰ کہ جرنیل بھی یہی کہتے تھے کہ ٹیکنالوجی کی دنیا ہے۔ افغان نہتے اور بے وسائل لوگ ہیں۔ یہ درختوں پر بیٹھے پرندوں کی طرح مارے جائیں گے۔ ایسے میں پورے ملک میں میرے جیسے چند ''بے وقوف'' لوگ بھی تھے جو کہا کرتے تھے کہ دیکھو اس کائنات میں ایک اور طاقت بھی

ہے جو اس کی فرماں روائے مطلق ہے اور جو کوئی صرف اور صرف اس پر بھروسہ کر لیتا ہے پھر یہ اس واحد و جبار کی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ اسے ذلت و رسوائی سے بچائے۔ آج موجودہ دنیا کی تاریخ میں واحد افغان قوم ہے، جو سرخ رو ہے۔ کسی قوم کے سینے پر عالمی طاقتوں کو شکست دینے کے اتنے زیادہ میڈل نہیں سجے، جتنے اس قوم کے سینے پر آویزہ ہیں۔

اللہ میرے ملک کو ذلت کی پستی سے نکالنے اور غیرت کی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرنے والا ہے۔ امریکہ اپنی شکست کا بوجھ اس پاکستان پر ڈال رہا ہے جس کے سیاستدان، دانش ور، سول سوسائٹی حتیٰ کہ جرنیلیوں کی اکثریت ان کے ٹکڑوں پر پلنے کو فخر سمجھتی رہی ہے۔ اس وقت میرے ملک میں دو گروہوں میں جنگ ہے۔ ایک جو سرتا پا اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آنے دو، پاکستان ہی امریکہ کا اصل قبرستان ثابت ہوگا۔ ویسے ویت نام سے لیکر جنوبی امریکہ تک امریکہ کے بہت سے قبرستان ہیں۔

دوسرا وہ طبقہ ہے جو اس قوم کو ڈرا رہا ہے۔ خود اپنے ہی ملک پر الزامات دھر رہا ہے کہ اصل شرارتی ہم ہیں جس کی امریکہ ہمیں سزا دینا چاہتا ہے۔ یہ سول سوسائٹی کے فیشن زدہ لوگ اور طاقت کے مندر میں سجدہ ریز دانش ور کمال کی گفتگو کر رہے ہیں۔ دیکھو باز آ جاؤ، اگر امریکہ نے حملہ کیا تو انتہا پسند چھا جائیں گے۔ واہ! جو امریکہ سے لڑے گا وہی چھائے گا۔ کبھی بز دل بھی چھائے ہیں۔ ایک اور منطق چھوڑی جا رہی ہے۔ امریکہ وہاں رہے گا، وہ جائے گا نہیں، کیا خوش فہمی ہے۔ اپنے اس ''عظیم'' مہربان کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، ویت نام میں رہا؟ چلی میں رہا؟ ہنڈراس میں رہا، بولیویا میں رہا؟؟؟

قوموں کی تاریخ میں یک جہتی، اتحاد اور یک جان ہونے کا مرحلہ اسی وقت آتا ہے جب ان کا دشمن مشترک اور خوفناک ہو۔ اللہ نے آدم کو تخلیق کیا تو ساتھ ہی ایک مشترکہ دشمن بھی وجود میں لایا گیا۔ اللہ نے فرمایا:

''بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

خوش نصیب ہوتی ہیں وہ قومیں جنہیں کوئی مشترکہ دشمن نصیب ہو جائے۔ جو ان میں غیرت جگا دے، ان کو حمیت سے جینا سکھا دے، ان کو متحد کر دے، ایسے ہی کھرا اور کھوٹا الگ ہو جاتا ہے۔ بز دل اور باغیرت کی پہچان ہو جاتی ہے۔ میرا اللہ فرق واضح کر دیتا ہے۔

(بہ شکریہ ''الاعتصام'' لاہور)